مقالاتِ اثر

تحقیقی و تنقیدی مضامین

ڈاکٹر محمد علی اثر

معاون پروفیسر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

نشاط پبلشرز۔ 20-4-226/9 محبوب چوک۔ حیدرآباد

Acc No.
792

© جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	:	مقالاتِ اثر
مصنف	:	محمد علی اثرؔ
اشاعت	:	۲۰۰۰ء
سرورق	:	سلام خوش نویس
کمپیوٹر کتابت	:	محمد ذکی الدین لیاقت۔ فون : 4577739
طباعت	:	دائرہ آفسٹ پریس، چھتہ بازار، حیدر آباد
قیمت	:	ایک سو پچاس روپے
ناشر	:	نشاط پبلشرز - 20-4-226/9 ، محبوب چوک، حیدر آباد۔500002 فون :4560338

MAQUALAT-E-ASAR

By Dr. MOHAMMAD ALI ASAR

Nishath Publishers, 20-4-226/9

Mehboob Chowk, Hyderabad-2

Price : **Rs. 150/-** Rel. : **2000**

ملنے کے پتے : ۱۔ حسامی بک ڈپو۔ چھتہ کمان۔ حیدر آباد

۲۔ بک ڈپو انجمن ترقی اردو۔ حمایت نگر۔ حیدر آباد

۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی۔ ممبئی۔ علی گڑھ

انتساب

کہکشاں اور فراز کے نام

بڑے ہو سب میں تم دونوں
بڑی ہیں تم سے امیدیں

محمد علی اثر

9
3-2001

حرفِ اوّل

پیش نظر کتاب راقم السطور کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین گذشتہ چار، پانچ برسوں کے دوران ہندوپاک کے مختلف ادبی اور تحقیقی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض مقالات اشاعت سے قبل مختلف سیمیناروں میں پڑھے جا چکے ہیں اور بعض مدیران رسائل کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں اور کچھ تدریسی ضروریات کے پیشِ نظر سپرد قرطاس کیے گئے ہیں۔ چند مضامین ایسے بھی ہیں جنھیں مختلف جامعات نے اپنی درسی کتابوں میں شامل کر لیے ہیں۔ کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے بیش تر مضامین پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا ممنون کرم ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے مضامین کا مطالعہ کرنے کی زحمت کی اور اپنے بیش بہا تاثرات سے سرفراز فرمایا۔

رفیقِ دیرینہ اور شاعر خوش فکر جناب سید بشارت علی کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ برادرم جناب فاروق شکیل سے بھی اظہار ممنونیت ضروری ہے جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک خوب صورت قطعہ تاریخ تحریر کیا۔ جناب محمد ذکی الدین لیاقت نے اس کتاب کی کمپیوٹر کتابت بڑی احتیاط اور توجہ سے کی میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اپنے فرزندوں محمد عادل فراز اور محمد سہیل افروز کے لیے بھی دعا گو ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں میرا ہاتھ بٹایا۔

محمد علی اثر

فہرست

حرفِ اوّل	۷
پیش گفتار : پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	۸
گجری اردو	۱۱
ملک محمود جوہر اور مثنوی اشتیاق نامہ	۲۱
علی عادل شاہ ثانی شاہی	۲۹
عہدِ عثمانی کا اردو ادب	۳۴
تہنیت النساء بیگم اور ان کی نعتیہ شاعری	۵۰
نظیر اکبر آبادی۔ شخص اور شاعر	۶۱
داستانوں میں تہذیبی عناصر	۶۹
رام پور کی داستانیں	۷۸

پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ	۸۹
علی گڑھ تحریک	۱۰۳
انجمن پنجاب	۱۱۱
ڈاکٹر کی زور کی تقاریر و خطبات	۱۲۱
ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار	۱۳۵
ادبی تاریخ نویسی کی روایت اور ڈاکٹر زور	۱۴۹
ڈاکٹر زور بہ حیثیت مدوّنِ متن	۱۶۵
قطعۂ تاریخ تصنیف	۱۸۰

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

پیش گفتار

دکنیات کے تعلق سے تلاش و تحقیق کی جو روایات مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور ان کے رفقاء نے قائم کی تھیں، عصر حاضر میں ان روایات کی پاسداری کرنے والوں میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر محمد علی آثر کا ہے۔ محمد علی آثر نے دکنیات میں کئی بنیادی اور امتیازی کام کئے ہیں۔ غواصی کی حیات و فن، دکنی غزل، دکنی مثنویوں وغیرہ پر ان کی کتابیں گراں قدر حیثیت رکھتی ہیں۔ دکنی اردو کے اور کئی شاعروں وغیرہ کے بارے میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے مجموعے جیسے "دکنی شاعری۔ تحقیق و تنقید"، "تحقیقی نقوش" اور "نوادراتِ تحقیق" شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں عصری اُردو کے فن کاروں اور موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر آثر کا ایک قابلِ ذکر کام "دکنی اور دکنیات" (متعلقہ کتابوں کی وضاحتی فہرست) ہے۔ جس کی ادبی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (پاکستان) نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ محمد علی آثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنی ناسازیٔ طبع کے باوجود لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی جذبہ و شوق کے ساتھ! ـــــ اور اب وہ اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ "مقالاتِ اثر" شائع کر رہے ہیں جس میں زور صاحب پر مجملہ (۴) کے آخری دو مضامین شامل کر لیں تو دکنیات پر مضامین کی تعداد (۵) ہو جاتی ہے گویا اس کتاب میں مشمولہ (۱۵) مضامین کے صرف (۵) کا تعلق دکنیات سے ہے۔ ملک محمود جوہر کی حیات اور اس کی

مثنوی ''اشتیاق نامہ'' کے بارے میں ڈاکٹر آثر نے کافی چھان بین کی ہے۔ زور صاحب اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے جوہر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بالترتیب یہی لکھ دیا کہ ''ان کا ذکر حیدر آباد کی تاریخوں اور تذکروں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ اور ''ان کے حالات کسی تذکرہ میں درج نہیں ہیں''۔ لیکن ڈاکٹر آثر نے ''عروس الاذکار''، ''تاریخ النوائط''، ''کیفیت و حالات روسائے ہنگن پلی'' اور خود جوہر کی مثنوی ''جوہر عشق'' سے معتدبہ حالات فراہم کرلیے و نیز جوہر کے کلام وغیرہ کے بارے میں انھوں نے زور صاحب، ہاشمی صاحب اور افسر صدیقی امروہوی صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے نہایت مدلل اور معقول انداز میں اپنی بات پیش کی ہے جو تا حال تحقیقات کی روشنی میں اپنا اعتبار رکھتی ہے۔ ڈاکٹر آثر نے گجری اُردو کے بارے میں بھی جو بحث کی ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے اور نتیجہ خیز...... یہ ایک اہم مضمون ہے کہ آثر نے اپنے خیالات کا دوٹوک اظہار کرتے ہوئے جہاں کسی سے اختلاف کیا ہے دلیل اور ثبوت سے صرفِ نظر نہیں کیا۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی اور نظیر اکبر آبادی۔ شخص اور شاعر تحقیقی کم اور تنقیدی اور تشریحی مضامین ہیں، شاہی کی شاعری کا اچھا جائزہ ہے۔ ادبی تاریخ نویسی کی روایت اور ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے بھی اسی نوعیت کے مضامین ہیں اور اچھے ہیں، البتہ ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری اور ان کی تقاریر و خطبات کا جائزہ زور صاحب کی شخصیت پر ایک نئے زاویہ سے روشنی ڈالتا ہے۔ تہنیت النساء بیگم کی نعتیہ شاعری میں بھی موضوع سے انصاف کیا گیا ہے۔ عہدِ عثمانی کے اردو ادب، داستانوں، پریم چند کی افسانہ نگاری، علی گڑھ تحریک، اور انجمن پنجاب پر، ہر چند کہ ہمارے ہاں کئی اصحاب نے قلم اٹھایا ہے، نئے زاویوں سے کام لیا اور نئے گوشے تلاش کیے ہیں، محمد علی آثر نے بھی ان موضوعات کا بڑی حد تک گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور سعی کی ہے کہ روشِ عام سے خود کو دور رکھیں۔ عہد عثمانی کے اردو ادب، داستانوں کے تہذیبی عناصر، رام پور کی داستانوں، علی گڑھ

تحریک اور انجمن پنجاب کے بارے میں ان کے مضامین ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر قلم اٹھانے سے قبل ڈاکٹر اثر نے گویا اس خصوص میں دیگر تحریروں کو سامنے رکھا اور پھر کوئی نئی بات کہی ہے۔ اس لیے پڑھتے ہوئے ان مضامین کی کئی باتیں نئی لگتی ہیں۔ جن میں ان کی اپنی شخصیت کی چھاپ ملتی ہے۔

اُردو میں تنقید نے اپنے خد و خال بہت زیادہ نکھار لیے ہیں اور قد آور بھی ہو چکی ہے اور نہ سہی ہندوستانی زبانوں میں یہ کسی سے پیچھے نہیں، بعض کے لیے تو قابلِ رشک ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر کی تنقید پر کسی خاص دبستان کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے ان کی تنقید کو ادبی اور سماجی تنقید کے آس پاس رکھا جا سکتا ہے لیکن جو چیز ان کی تنقیدی تحریروں کو ممیّز کرتی ہے وہ ان کا معروضی رویہ ہے۔ تحقیق سے ان کی دل چسپی نے ان کے ہاں اس معروضیت کو اور چمکایا ہے۔ وہ اپنی بات کسی رو، رعایت کے بغیر اور بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔ تاہم سلیقہ اور اہتمام سے۔ شستہ و شائستہ اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

اثر شاعر بھی ہیں اور خوب شاعری کرتے ہیں۔ ان کے دکنیات کے ذوق سے شاعرانہ مزاج کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ ان کے تحقیقی مضامین بھی بوجھل اور گنجلک انداز تحریر سے دور ہیں جب کہ تحقیق کرنے والوں کے ہاں یہ چیز کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ در آتی ہے۔ ڈاکٹر اثر کا پیرایۂ بیان صاف، شفاف اور سہل و سادہ ہوتا ہے۔ وہ وضاحت اور صراحت سے بھی کام لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین کے اور مجموعوں میں بھی دکنی کے علاوہ اور موضوعات پر بھی توجہ دی ہے لیکن اس مجموعہ میں ایسے مضامین کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

"مقالاتِ اثر" اہم ادبی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ باذوق ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

گجری اُردو

گجرات کا لفظ پراکرت اور سنسکرت کے الفاظ گوجراٹھ یا گرجر راشٹر سے بنا ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں گوجروں کا دیس۔ مورخین کا بیان ہے کہ گوجر دراصل گرجستان (جارجیہ) کے باشندے تھے اور سنہ عیسوی کی ابتدائی دو تین صدیوں میں ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے سندھ اور ملتان کو اپنا مسکن بنایا تھا اور پھر مارواڑ، مالوہ اور گجرات سے ہوتے ہوئے دکن تک پھیل گئے۔ گپتوں کے عہدِ حکومت میں گوجر قوم کے متعدد افراد راجپوتانہ، مالوہ اور گجرات میں فوجی اور نیم فوجی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے (۱)۔ چوتھی صدی عیسوی کی آخری دہائی میں جب گپتوں کی حکومت روبہ زوال ہوئی تو یہ لوگ ۳۹۵ء میں ایک خود مختار سلطنت کے مالک بن گئے (۲)۔

گوجر قوم نے اپنے جنوبی مقبوضات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک جو سب سے بڑا حصہ تھا مہاراٹھ (مہاراشٹر) کہلاتا تھا، دوسرا گوجراٹھ اور تیسرا سوراٹھ۔ مسلمان حکمرانوں نے گوجراٹھ کو گجرات بنادیا۔ بہ قول این۔ بی دِویٹیا "موجودہ گجرات کو گجرات کا نام مسلمانوں کے صوبہ گجرات پر اقتدار قائم ہونے کے بعد ملا۔ یعنی بارھویں صدی عیسوی میں اس علاقے کو گجرات کا نام دیا گیا (۳)۔

گجرات پر بیرونی حملہ آوروں میں محمود غزنوی اور معزالدین محمد بن سام نے علی الترتیب ۱۰۲۴ء اور ۱۱۷۴ء میں حملے کیے تھے اور ہندوستانی حکمرانوں میں قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۵ء میں اور علاءالدین خلجی نے ۱۲۹۶ء میں حملہ کیا تھا لیکن علاءالدین خلجی کی فتح گجرات اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اس واقعہ نے ایک طرف ہندوستان کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر غیر معمولی اثرات چھوڑے تو دوسری طرف لسانی

سطح پر بھی عمل حرکت کو تیز کیا۔ علاء الدین خلجی نے گجرات کے علاوہ مالوہ اور دکن کے علاقوں کو بھی فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا اور اپنے مفتوحہ علاقوں کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر کے ہر صوبے کے لیے ایک ترک افسر جو "امیرِ صدہ" کہلاتا تھا مقرر کیا۔ یہ افسر دہلی سے بھیجے جاتے تھے اور اپنے اپنے حلقوں کے حقیقی حکمران کی حیثیت رکھتے تھے۔ گجرات کے علاقے میں ۱۲۹۶ء سے تقریباً سو سال تک دہلی سے افسر آتے رہے۔ فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں جب دہلی کی سلطنت میں ضعف آگیا تو گجرات کے امیر صدہ ظفر خاں نے مظفر شاہ کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سلاطینِ گجرات کے دورِ حکومت کا آغاز ہوا جو ایک سو چوراسی سال تک جاری رہا۔ گجرات میں ایک اور لسانی انقلاب اس وقت رونما ہوا جب ۱۵۷۳ء میں اکبرِ اعظم نے اس علاقے کو فتح کر کے ایک بار پھر سلطنت دہلی کا صوبہ بنا دیا تھا۔

اُردو زبان کی وہ شاخ جو گجرات پہنچی اسے گجری کے نام سے موسوم کیا گیا۔ علاء الدین کی فتحِ گجرات (۱۲۹۶ء) میں اس کو نہ صرف بولی کے مرحلے سے آگے بڑھ کر زبان کی منزل میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے بلکہ اس میں شعر و ادب بھی تخلیق کیا جاتا ہے علاء الدین کی فتحِ گجرات کا واقعہ سیاسی سے زیادہ لسانی اور ادبی اعتبار سے اہم ہے، کیوں کہ دہلی میں بسنے والی فوجوں کے سپاہی، سرکار کا عملہ، انتظام کرنے والے افسر اور ان کے کار پرداز سبھی اس زبان کو بولتے ہوئے گجرات آئے ہوں گے جو دہلی اور اس کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی (۴)۔ سلطنت گجرات کا بانی مظفر شاہ ہندی نژاد تھا اور اس کی مادری زبان عربی یا فارسی نہیں بلکہ کوئی ہندوستانی زبان رہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں مقامی زبانوں کی طرف خصوصی طور پر توجہ مبذول کی جانے لگی۔ بہ قول ڈاکٹر محمد حسن "مرکزی سلطنت سے ٹوٹ کر آزاد خود مختار ریاستوں کے حکم رانوں کو، مقامی آبادی کی حمایت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور اس لیے وہ اپنے علاقے کے عوام اور ان کی زبان اور تہذیب سے دہلی کی مرکزی حکومت اور اس کے حکم رانوں کے مقابلے میں زیادہ قریب رہنا چاہتے ہیں اور اس کی سرپرستی کرتے

ہیں (۵)۔ چناں چہ یہ دیسی زبانوں اور مقامی روایات کا اثر ہی ہے کہ مظفر شاہ نے جس میدانِ جنگ میں راستی خاں کو شکست دی تھی اس کا نام "جیت پور" رکھا۔ گجرات کے نامی گرامی سلطان محمود شاہ کو "محمود بیگڑا" اس لیے کہا جانے لگا کہ وہ اپنی لمبی موچھوں کو اوپر چڑھاکر باندھتا تھا۔ گجراتی میں بیگڑو اس بیل کو کہتے ہیں جس کی دونوں سینگیں اندر کی جانب مڑی ہوئی ہوتی ہیں (۶)۔ مقامی زبانوں سے اثر پذیری کے لسانی عمل کا اندازہ اُن ناموں سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو اس وقت مسلمان گھرانوں میں مقبول تھے چند نام ملاحظہ ہوں :

شاہ پیارن، شاہ باجن، شاہ جیو گام دھنی، میاں جی، مولاجی، سید بڈھن، شاہ منجھلا، شاہ بھیکن، منجھن میاں، بجھو میاں، جمال پتھری، آدھین مہدی، مولانا میاں۔

اُردو زبان کے قدیم ترین نام ہندی اور ہندوی ہیں لیکن علاقائی مناسبت سے اسے زبانِ دہلوی، گجری اور دکنی سے بھی یاد کیا گیا۔ حضرت امیر خسرو (م ۱۳۲۵ء) نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں جہاں مختلف ہندوستانی زبانیں جیسے سندھی، لاہوری، دہلوی، کشمیری، تلنگی وغیرہ کے نام گنوائے ہیں، وہیں گجری کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

سندھی و لہوری و کشمیری و کبر
دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال واود
دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد (۷)

گجرات کے صوفیوں اور شاعروں نے جہاں اپنی زبان کو دہلوی، ہندی، ہندوی کہا ہے وہیں گجری "گوجری" یا "بولی گجراتی" کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ قدامت کے اعتبار سے گجرات کے شاعروں میں شیخ احمد کھٹو (پیدائش ۷۳۶ھ) اور شاہ باجن (۷۹۰۔ ۹۱۲ھ) کو اہمیت حاصل ہے۔ چوں کہ شیخ احمد کھٹو کے صرف دو تین دوہرے دریافت ہوئے ہیں (۸)۔ اس لیے ان کی زبان کے تعلق سے کچھ کہنا دشوار ہے تاہم شاہ باجن

نے اپنی زبان کے لیے دہلوی، ہندوی اور گجری کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔
ایک نظم کی سرخی انھوں نے اس طرح قائم کی ہے:

"صفت دنیا بہ زبان دہلوی نوشت" (۹)

اسی نظم کی سرخی ایک اور نسخے میں اس طرح ملتی ہے:

"صفت دنیا ایں درویش بہ زبان ہندوی گفت است" (۱۰)

باجن کی زبان کے تعلق سے متذکرہ بالا نتائج پروفیسر محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے بیانات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی نے پہلی بار باجن کی زبان کو "زبانِ دہلوی لکھا تھا۔ جس کی تقلید کم و بیش سبھی محققین نے کی ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر شیخ فرید نے "شاہ بہاء الدین باجن حیات اور گجری کلام" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں انھوں نے "خزانۂ رحمت" کے پانچ قلمی نسخوں کا تعارف بھی کروایا ہے۔ ڈاکٹر فرید کا خیال ہے کہ شاہ باجن نے اپنی زبان کے لیے "زبانِ دہلوی" کے الفاظ استعمال نہیں کیے اور "بہ زبانِ دہلوی" کا عنوان بعد کا الحاق ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں "شیرانی صاحب کے پاس بارھویں صدی کے خاتمے کا مکتوبہ (نسخہ) سخت غلط تھا۔ اشتباہ ہے کہ بہ زبان دہلوی کا عنوان بعد کا الحاق ہو۔ راقم کے پیشِ نظر جو نسخے ہیں ان میں یہ لفظ دہلوی نہیں ہے۔" (۱۱)

شاہ باجن کے ہم عصر سید محمد مہدی جونپوری (م ۹۱۰ ھ) کے ارشادات کی زبان کو "زاد الفقراء" کے مولف نے گجری بتایا ہے:

"میراں سید محمد مہدی موعودؑ در بیان صفت فقرا بہ زبان گجری فرمودہ است" (۱۲)

شاہ علی جیوگام دھنی (م ۹۷۳ ھ) کے دیوان "جواہر اسرار اللہ" کو "تحفۃ الہند" اور "مراۃ احمدی" میں ہندی بتایا گیا ہے جب کہ اس دیوان کے دونوں مرتبین شیخ حبیب اللہ اور سید ابراہیم اسے گجری کہتے ہیں:

"در بیان توحید و اسرار بہ الفاظ گجری بہ طریق نظم نمودہ بود" (۱۳)

قاضی محمود دریائی بیرپوری (م ۹۴۱ ھ) کی زبان کے بارے میں مجموعۂ ملفوظات "

تحفتہ القادری" میں ہندوی اور گجری دونوں نام ملتے ہیں (۱۴)۔ خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳ھ) "خوب ترنگ" میں اپنی زبان کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں :

جیوں میری بولی منہہ بات　　　عرب عجم مل ایک سنگات

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "من بہ زبان گجرات کہ الفاظ عربی و عجمی آمیزاست گفتہ ام" (۱۵)۔ رسالہ "بھید بھاؤ" میں انھوں نے اپنی زبان کو "بولی گجرات" کہا ہے :

جیوں دل عرب عجم کی بات　　　سن بولے بولی گجرات

خوب محمد چشتی کے بعد گجرات کے دوسرے شاعروں مسکین، امین، نصیر الحق، عبداللہ واعظ، افضل، عباد اللہ اور احمد نے اپنی زبان کو گجری قرار دیا ہے۔

سلطنتِ گجرات کے زوال کے بعد گجری اُردو، دکنی زبان و ادب پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ چناں چہ بیجاپور کے مشہور صوفی حضرت برہان الدین جانم (م ۱۰۰۷ھ) اپنی زبان کو ہندی بھی کہتے ہیں اور گجری بھی۔ چناں چہ وہ "ارشاد نامہ" میں لکھتے ہیں :

عیب نہ راکھیں ہندی بول　　　معنی تو چک دیکھیں کھول

یہ سب گجری کیا بیان　　　کر یہ آئینہ دیا نمان

"حجت البقا" میں کہتے ہیں :

جے ہویں گیان بچاری　　　نہ دیکھیں بھاکا گجری

کلمتہ الحقائق میں انھوں نے اپنی زبان کو گجری لکھا ہے :

"سبب یو زبان گجری نام ایں کلمتہ الحقائق۔"

اس تفصیل سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ گجرات میں نویں صدی ہجری کے ربعِ سوم تک اُردو کے نام ہندی اور ہندوی تھے۔ دوسرے یہ کہ شاہ بہاء الدین باجن کی "خزائن رحمت" کی ترتیب کے زمانے (۸۷۳ھ) میں اس کے لیے ہندی کے علاوہ گجری کا نام بھی مروج ہوا۔ دسویں صدی کے نصف دوم میں اس کا متداول نام گجری ملتا ہے۔ تیسرے یہ کہ گجری زبان و ادب اور اس کی مخصوص روایات

کا حلقہ۔ اثر صرف گجرات تک محدود نہیں رہا بلکہ دکن تک پھیل چکا تھا۔ غالباً اسی لیے جانم نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں :

"اس عہد کی تواریخِ دکن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجاپور آیا کرتے تھے۔ وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلالیا۔ چناں چہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اُردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں حصہ لیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اُردو مصنفین جیسے شاہ برہان اپنی زبان کو گجری کہنے لگے" (۱۶)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں :

"دکنی ادب پر گجراتی ادب کے اثرات کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ شاہ برہان الدین جانمؔ اپنی تصانیف میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں ـــــ بیجاپور کے شاہ برہان کا اپنی زبان کو گجری کہنے کے معنی یہ تھے کہ تصنیف کرتے وقت ان کے سامنے گجراتی زبان و ادب ایک معیار کی حیثیت رکھتے تھے" (۱۷)۔

حضرت جانمؔ نے اپنی زبان کو اس لیے بھی گجری کہا ہوگا کہ غالباً اس وقت تک دکنی کی اصطلاح عام نہیں ہوئی ہوگی۔ دکنی کے قدیم مصنفین میں کسی نے بھی اپنی زبان کو دکنی نہیں کہا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جب قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا تو دکنی شاعروں نے اپنی زبان کو ہندی یا ہندوی کے علاوہ دکنی کہنا شروع کیا۔ بہ قول ڈاکٹر مسعود حسین خاں :

"اُردو زبان کا دکنی نام بہت زیادہ قدیم نہیں۔ عہدِ بہمنی کے کسی مصنف نے اپنی زبان کو دکنی نام سے نہیں پکارا۔ اس کے ہندی، ہندوی اور گجری نام زیادہ قدیم ہیں" (۱۸)۔

جناب اکبر الدین صدیقی جانمؔ کی زبان گجری کو ایک نئے مفہوم میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"دکن کے اکثر قصبات میں خواہ وہ حیدرآباد ریاست کے ہوں یا میسور ریاست کے

شاہراہ پر کسی مخصوص جگہ روزآنہ بھاجی ترکاری یا دیگر ضروریاتِ زندگی یا مستعملہ سامان کی عارضی دوکانیں لگتی ہیں، اور بازار کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ چوں کہ یہ دوکانیں مستقل نہیں ہوتیں اس لیے ان کا کاروبار دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا اور چوں کہ یہ گذرگاہ پر ہوتی ہیں اس لیے ان کو گذری کہا جانے لگا۔ اور کثرت استعمال سے گجری ہوگیا ۔۔ حضرت برہان الدین جانمؒ نے منفعت لایمان اور کلمۃ الحقائق کی زبان کو انھیں معنوں میں گجری کہا ہے۔ اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق گذری سے ہے" (۱۹)۔

یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ جانمؒ نے اپنے ہم عصر گجراتی مصنفین کے برعکس، گجری کو ایک نئی اصطلاح کے طور پر نئے معنیٰ و مفہوم میں استعمال کیا ہو۔ ایک تو اس لیے کہ بہ قول ڈاکٹر حسینی شاہد گذری کا لفظ چوک اور شام کے بازار کے مفہوم میں صرف دکنی ہی میں نہیں شمالی ہند میں بھی رائج رہا ہے۔ استاد ذوقؒ کا ایک شعر ہے :

بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزارہا ۔۔۔ گذری ہے اس کی راہ گذر پر لگی ہوئی" (۲۰)

دوسرے یہ کہ اگر جانمؒ نے گجری کا لفظ نئے مفہوم میں استعمال کیا ہوتا تو کم از کم ان کے خلفاء یا خانوادۂ جانم کے دوسرے مصنفین ضرور اسے رواج دینے کی کوشش کرتے۔

گجری زبان میں سلاطینِ گجرات اور صوفیاء کے جو فقرے، جملے اور اقوال ہم تک پہنچے ہیں ان میں محمود بیگڑا، سلطان سکندر شاہ، حضرت قطب عالم، شاہ عالم اور شاہ بارک اللہ حسینی اور جن شعراء نے گجری میں طبع آزمائی کی ہے ان میں شیخ احمد کھٹو، شاہ باجن، شاہ علی جیو گام دھنی، قاضی محمود دریائی اور امین گجراتی کے نام بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس زبان میں عربی و فارسی کے ساتھ گجراتی زبان کے الفاظ مل جل کر شیر و شکر ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور گجراتی کے چند الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں :

ہوں (میں) ہب (اب) اونڈا (گہرا) ڈوسی (بڑھیا) ٹونکا (تھوڑا) جے (جو)

اسنے (اور) ایہاں (یہاں) تُمہ (تم) ملنہ (میں) پچھو (پھر، بعد) پونگرا (لڑکا)

اوتاول (جلدی) گھناں (بہت زیادہ) مہاڈھ (ایوان) ڈھوکڑا (نزدیک) ہڑواڑ (قبرستان)

یکھان (ستائش) وغیرہ۔

گجری کے توسط سے دکنی میں ہوں، جے، اوتاول، انجھو، ندرا، دسن، کرتار، پالنہار، سرجنہار، نیکا، رکت، اندھلا، ڈونگر، نھاسنا، گمنا، اچھنا، سٹیا، دیکھیا، بولیا، پچھیں، اچھے، اچھو اور اس قسم کے بے شمار الفاظ آئے ہیں۔

گجری زبان و ادب پر ہندوستانیت کی چھاپ اور بھکتی کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاعری ہندی اوزان و بحور میں مختلف راگ راگنیوں اور سرُوں کے مطابق موسیقی اور آواز کا جادو جگانے کے لیے کی جارہی ہے۔ اصنافِ شعر میں دوہرے اور جکری سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ ہندی شاعری کے زیرِ اثر خالق کو مرد اور خود کو عورت یا گوپی تصور کرکے ہجر و فراق کی کیفیات کی ترجمانی کی جارہی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"اس شاعری میں خدا اور اس کے نبی ﷺ کا ذکر بھی ہے اور کرشن و اوتار کا بھی۔ وحدت الوجود اور تصوف کے دوسرے نکات بھی ہندی اسطور کے ذریعے بیان کیے جارہے ہیں۔ عشق و محبت کے اظہار پر بھکتی کال کا اثر واضح ہے۔ گجری شاعری کی بحریں، اوزان اور اصناف بھی ہندوستانی ہیں" (۲۱)۔

دسویں صدی ہجری کے اواخر میں مملکت گجرات روبہ زوال ہوگئی۔ ہر طرف انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر اعظم نے نہ صرف گجرات پر حملہ کرکے فتح حاصل کی بلکہ پھر ایک بار اسے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنادیا۔

اکبرِ اعظم کا گجرات پر یہ حملہ وہاں کی شعری اور ادبی روایات پر لسانی حملے کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ خوب محمد چشتی کے زمانے میں گجری زبان و ادب پر ایک طرف فارسی کا رنگ و اثر نمایاں ہونے لگتا ہے تو دوسری طرف اس میں عربی و فارسی کے الفاظ بہ کثرت شامل ہونے لگتے ہیں۔ اس لسانی عمل کی وجہ سے اُردو زبان اپنے نشوو نما اور ارتقا کی نئی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ گجری پر فارسی کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ خوب محمد کو اپنی مثنوی "خوب ترنگ" کی شرح فارسی میں قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی ضرورت کے تحت انھوں نے ہندی اور فارسی عروض پر "چھند چھنداں"

کے نام سے ایک رسالہ منظوم کیا تھا جس میں فارسی عروض کو ہندوی عروض کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لسانی اتھل پتھل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

"فتح کے دس بارہ سال کے اندر اندر گجرات کے اہلِ علم و ادب پر بھی فارسی کا گہرا اثر ہونے لگا اور اسی کے ساتھ گجری کا نہ صرف زور گھٹنے لگا بلکہ ادبی و تخلیقی سطح پر اس زبان کی کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی۔ جو لوگ فارسی جانتے تھے معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔۔۔۔ اسی تہذیبی اثر کے ساتھ فارسی روایت اپنی بحور، اپنے اوزان، اپنی اصناف، تمثیلات، رمزیات و صنمیات کے ساتھ گجری اُردو پر بھی تیزی کے ساتھ اثر انداز ہونے لگی۔ خالص ہندوی سانچوں کے بجائے فارسی سانچا اس کی جگہ لینے لگا" (۲۲)۔

حواشی :۔

۱۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ سخن ورانِ گجرات۔ ۱۹۸۱ء ص ۱۷۔

۲۔ ایضاً ص ۱۷۔

۳۔ "سابر نامہ" گجرات اُردو اکیڈمی۔ ۱۹۹۰ء ص ۶۴ (گجرات کی وجہ تسمیہ از جمال الدین شیخ ساحر)

۴۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ قدیم اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ لکھنو ۱۹۸۶ء ص ۷۱۔

۵۔ ایضاً ص ۷۲۔

۶۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ سخنورانِ گجرات۔ ص ۲۷۔

۷۔ محمد وحید مرزا۔ مثنوی نہ سپہر از امیر خسرو۔ کلکتہ ۱۹۴۸ء ص ۱۷۹۔۱۸۰۔

۸۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ سخنورانِ گجرات۔ ص ۴۷۔

۹۔ ایضاً ص ۶۵۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ڈاکٹر شیخ فرید۔ شاہ بہاء الدین باجن۔ حیات اور گجری کلام۔ گجرات ۱۹۹۲ء ص ۲۱۔

۱۲۔ پروفیسر محمود شیرانی۔ مقالاتِ شیرانی (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۹۸۔

۱۳۔ ڈاکٹر حسینی شاہد۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے۔ حیدرآباد ۱۹۷۳ء ص ۴۸۶۔

۱۴۔ سخنورانِ گجرات۔ ص ۳۱۔

۱۵۔ ڈاکٹر مدنی۔ سخوارانِ گجرات۔ ص ۳۱۔

۱۶۔ اُردو شہ پارے۔ ص ۱۲۔

۱۷۔ ادبی تحقیق۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۹۴ء ص ۶۰۔

۱۸۔ مجلہ عثمانیہ (دکنی ادب نمبر) ۱۹۶۳ء ص ۱۳۔

۱۹۔ مثنوی ارشاد نامہ (جانم) حیدرآباد ۱۹۷۱ء ص ۴۲۔

۲۰۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ حیات اور کارنامے۔ ص ۴۸۶۔

۲۱۔ ادبی تحقیق۔ ص ۵۲۔

۲۲۔ تاریخ ادب اُردو (جلد اول) لاہور ۱۹۹۵ء ص ۱۲۷ ۔ ۱۲۶۔

ملک محمود جوہرؔ اور مثنوی اشتیاق نامہ

ملک محمود جوہرؔ (ولادت ۱۱۹۴ء) اردو اور فارسی کے ایک قادر الکلام اور باکمال شاعر تھے۔ ڈاکٹر زور نے سب سے پہلے ۱۹۵۷ء میں مثنوی "جوہر عشق" کے مصنف کی حیثیت سے اُن کا تعارف کرواتے ہوئے تذکرۂ اردو مخطوطات کی تیسری جلد میں لکھا تھا:

"ملک محمود جوہرؔ ولد قاضی عیدروس ولد قاضی احمد ثانی قاضی پیگن پلی۔ حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے شاگرد تھے۔ نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد میں حیدر آباد میں مقیم تھے لیکن ان کا ذکر حیدر آباد کی تاریخوں اور تذکروں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔" (ص ۲۲۱)

مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اسی سال جب کتب خانۂ سالار جنگ کے اردو مخطوطات کی فہرست مرتب کی تو انھوں نے جوہرؔ کا تعارف ان کی ایک اور مثنوی "اشتیاق نامہ" کے حوالے سے کرواتے ہوئے اطلاع دی ہے کہ:

"ملک محمود جوہرؔ حیدر آباد کے خوش فکر شاعر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے حالات کسی تذکرہ میں درج نہیں ہیں۔" (ص ۶۹۵)

راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق ملک محمود جوہرؔ کے حالاتِ زندگی حیدر آباد کے دو تذکروں "عروس الاذکار" از نصیر الدین نقش حیدر آبادی (۱۲۸۹ھ) اور "تاریخ النوائط" (۱) از عزیز جنگ کے علاوہ ملک محمود جوہرؔ کے فرزند غلام حیدر شہوارؔ اور پوتے غلام محی الدین شہیارؔ کے دواوین اور تذکرہ "کیفیت وحالات روسائے پیگن پلی" اور خود جوہرؔ کی مثنوی "جوہرِ عشق" میں بھی موجود ہیں۔

"جوہر عشق" (۱۲۴۲ھ) تقریباً پانچ ہزار ابیات پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی ہے جس کا واحد نسخہ کتب خانۂ ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد کی زینت ہے۔ بہ قول ڈاکٹر زور اتنی طویل مثنوی جوہر کے بعد حیدر آباد کے کسی شاعر نہیں لکھی (۲)۔ جوہرِ عشق کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس مثنوی میں شاعر نے "کیفیتِ آباواجداد خود" کے عنوان سے اپنے خاندانی حالات قلم

ہند کیے ہیں۔ جن کا خلاصہ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں درجِ ذیل ہے :

"ملک محمود، جوہر تخلص عرب قوم نوائت میں حضرت جعفر طیار کی اولاد سے تھے۔ ان کے جد امجد ملا احمد علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے۔ ان کی اولاد میں ملاّ سعید اور ملا یحییٰ اور فاضل خاں وزیر بہت مشہور گزرے ہیں۔ زوال بیجاپور کے وقت فاضل خاں وزیر کبیر تھے۔ اور اورنگ زیب عالمگیر ان کو بھی بیجاپور کے دیگر عمائدؔ کی طرح اپنے ساتھ لے گئے چناں چہ وہ اثنائے سفر میں ہی وفات پا گئے۔ ان کے فرزند ملاّ احمد کو اورنگ زیب نے کرنول کا قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کے دو فرزند تھے۔ غلام علی اور محمود۔ غلام علی اور ان کی اولاد تو کرنول ہی میں مقیم ہو گئے، لیکن بڑے فرزند ملاّ محمود بنگن پلی چلے گئے اور ان کے فرزند قاضی احمد بنگن پلی کی مسند قضائت اور انعام سے سرفراز ہوئے۔ ان کے فرزند صبغت اللہ اپنے باپ کی جگہ قاضی بنے۔ ان کے فرزند قاضی عیدروس ملک محمود کے والد تھے چناں چہ جوہر کے بڑے بھائی بنگن پلی کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ریاست بنگن پلی کے نوابوں مرزا محمد فضل علی، حسین علی خاں، منصور الدولہ احمد علی خاں کی تعریف لکھی ہے کیوں کہ یہ لوگ جوہر کے خاندان کے قدردان اور مربی تھے۔ خود جوہر کے سرپرست شہیار الملک تھے جو اس وقت نواب بنگن پلی تھے۔ ان کو افسوس ہے کہ وطن چھوڑ کر حیدرآباد آنا پڑا۔ نواب احمد علی خان کی مدد سے وہ حیدرآباد سے بہرہ ور ہوئے اور یہاں کے شاعروں کے فیضِ صحبت سے شعر و سخن کی طرف دل مائل ہوا اور آخر کار یہ مثنوی لکھی۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ ان کے آل اولاد تھی اور بھائی بند حیدرآباد کرنول اور بنگن پلی میں موجود تھے"(۳)۔

نصیر الدین نقش حیدرآبادی کے تذکرہ "عروس الاذکار" سے پتہ چلتا ہے کہ جوہر نے دو دواوین کے علاوہ ایک تذکرہ بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں :

"جوہر تخلص، ملک محمود، مولدش بنگن پلی، صاحب، دو دیوان و تذکرہ۔ تلمیذ جناب حافظ تاج الدین مشتاق علیہ الغفران آوردہ اند کہ مشارالیہ بر علتے از حسین علی خاں نواب بنگن پلی آزردہ شدہ در قمر نگر عرف کرنول رفتہ بہ ماہوار دو صد روپیہ نزد غلام رسول خاں نواب مرحوم بہ سلک ملازمت منسلک گردیدہ ہمدراں جا انتقال یافت"(۴)۔

تذکرہ عروس الاذکار کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو (مخطوطہ نمبر ۸۹۲) میں موجود ہے۔

اس مخطوطہ میں شامل تمام شعرا کی فہرست ڈاکٹر زور نے مرتب کر کے تذکرہ میں شامل کی ہے لیکن انھیں تذکرے کے نام، مولف اور سنہ تالیف کا ٹھیک طور پر پتہ نہ چل سکا اور چوں کہ یہ قلمی نسخہ تمکین کاظمی کا عطیہ تھا اس لیے اس کا نام ''تذکرہ عطائے تمکین'' تجویز کیا اور سنہ تالیف قیاساً ۱۲۹۲ھ تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا ہے اس تذکرہ کے مولف نصیر الدین نقش حیدر آبادی (متوفی ۱۳۴۵ھ) ہیں اور ''عروس الاذکار'' اس کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۹ھ کے اعداد بر آمد ہوتے ہیں اور یہی اس کا سنہ تالیف بھی ہے۔ اس تذکرہ کے دو اور قلمی نسخے انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان نسخوں کی مدد سے مولوی افسر صدیقی امروہوی نے اسے ۱۹۷۵ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

جوہر کے فارسی دیوان اور تذکرے کا تو پتہ نہیں چلا البتہ ان کے اُردو دیوان کا ایک نسخہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) میں موجود ہے۔ (مخطوطہ نمبر ۱۶۲۹)۔ نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ میں دیوانِ جوہر کے ایک اور نسخہ کی نشاندہی کی ہے (۵)۔ لیکن تلاش وبسیار کے باوجود اس نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ مثنوی ''جوہر عشق'' اور دیوان کے علاوہ جوہر کی ایک اور مثنوی ''اشتیاق نامہ'' کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تا حال اس کے دو نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے (مخطوطہ نمبر ۴۶۳) اور دوسرا اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری کی زینت ہے (مخطوطہ نمبر ۳۴۵) آخر الذکر مخطوطہ کی توضیح کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں "افسوس ہے کہ ان کے حالات کسی تذکرے میں درج نہیں ہیں۔ ان کے فرزند غلام حیدر شہہ سوار تخلص رکھتے تھے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں شاعری کا سلسلہ عرصہ تک چلا ہے" (۶)۔ جوہر کے فرزند غلام حیدر کا تخلص شہہ سوار نہیں بلکہ شہوار ہے۔ ہاشمی صاحب نے ''دیوان شہوار'' کی وضاحت کرتے ہوئے بھی ان کا تخلص سہواً شہہ سوار ہی لکھا ہے (۷)۔ شہوار اپنے والد کی طرح ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ تذکرۂ عروس الاذکار کی تالیف کے وقت ۱۲۸۹ھ میں وہ حیدر آباد میں موجود تھے (۸)۔ ان کے دیوان کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں موجود ہے (مخطوطہ نمبر ۶۳۹) اور دوسرا اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری حیدر آباد کا مخزونہ ہے (مخطوطہ نمبر ۷۰) و نیز ان کا کچھ کلام ان کے بیٹے غلام محی الدین شہیار کے مجموعہ کلام مخزونہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں بھی موجود ہے (۹)۔ شہوار حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے علاوہ اپنے والد جوہر سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں انھوں نے اپنے اساتذہ کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

استاد کلاں حافظ مشتاق ہیں شہوارؔ اور حضرت جوہرؔ

پھر دوسرا شاعر کرے کیا چوں مرے آگے ہوں سب میں زبردست (۱۰)

اس شعر میں جوہرؔ تخلص کے پیشِ نظر ڈاکٹر زور نے قیاساً غلام حسین خاں جوہر کو شہوارؔ کا استاد قرار دیا ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں : ''انھوں نے (شہوارؔ نے) اپنے ایک اور استاد جوہر کا اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ وہی غلام حسین خاں جوہر حیدری ہوں گے جنھوں نے ماہ لقابائی کے حکم سے انھیں کے یہاں رہ کر تاریخ ''ماہ نامہ'' مرتب کی تھی (۱۱)۔ شہوارؔ نے اپنے دیوان میں جوہرؔ کی ایک فارسی نظم (قطعۂ تاریخ وفات حضرت شاہ معصوم اولیاء کرنولی) کی اردو میں تضمین بھی کی ہے۔ اس نظم کی داخلی شواہد سے ڈاکٹر زور جوہرؔ کو شہوار کا والد بتاتے ہوئے بالکل صحیح نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر کسی ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> ''اس نظم میں کرنول کے ایک بزرگ حضرت معصوم شاہ مجذوب کے عرس کی دھوم دھام بیان کی گئی ہے۔ اور جوہر کے قطعہ تاریخ وفات شاہ معصوم اولیا کو بھی درمیان میں درج کر دیا ہے۔ جس میں جوہرؔ کو اپنا قبلہ گاہ لکھا ہے جو بالعموم والد یا مرشد یا استاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ شاعر کے تخلص شہوار اور جوہر میں بھی مناسبت ہے اس لیے فی الحال یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ جوہر' شہوار کے والد تھے یا وہی جوہر حیدری ہیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے'' (۱۲)۔

شہوارؔ کی تضمین کے چند بند ملاحظہ ہوں جن سے شہوار کے رنگِ سخن اور جوہرؔ کی تاریخ گوئی دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔

لاتے ہیں جو مراد مند ہجوم وہاں سے پھرتا نہیں کوئی محروم
مرتبہ ان کا کسی کو کیا معلوم اولیائے مکرم و مرحوم
یعنی کرنول میں بڑی ہے دھوم
ہے بپا عرس حضرت معصوم

دو ہیں دروازے بہر مجرائی ایک چوبلی دگر ہے نقرائی
ان کی تاریخ سن لے اے بھائی ہے مرے قبلہ گاہ نے پائی
یعنی کرنول میں بڑی ہے دھوم

شاہ معصوم اولیا چو نہاد قدم خود بخلد بسم اللہ

سال رحلت شنیدہ ام جوہر "آفتابِ قمر نگر باللہ"
۱۲۶۲ھ
یعنی کرنول میں بڑی ہے دھوم

جمع وہاں خلق عام ہوتی ہے عرس کی دھوم دھام ہوتی ہے
جب کہ شہوار شام ہوتی ہے روشنائی تمام ہوتی ہے
یعنی کرنول میں بڑی ہے دھوم (۱۳)

بہ قول ڈاکٹر زور شہوار ایک فطری شاعر تھے۔ ان کے کلام میں بڑی روانی ہے اور وہ غزل اور نظم دونوں میں قادر الکلام ہیں۔ انہوں نے غزلوں سے زیادہ مخمس، مسدس اور دیگر ترکیب بند لکھے ہیں جن میں سودا، ظفر اور ناسخ کی غزلوں کی تضمینیں بھی کی ہیں۔ شہوار نے فارسی اور ہندی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا مخزونہ نسخہ "دیوان شہوار" خود شہوار کا مکتوبہ ہے (۱۴)۔

شہوار کے بڑے بھائی غلام حسن کا تخلص گوہر تھا تاہم ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔ شہوار کے فرزند غلام محی الدین شہیار نے شاعری ورثے میں پائی تھی۔ ان کے ایک مختصر مجموعۂ کلام کے علاوہ ایک تذکرے "کیفیت وحالات روسائے بنگن پلی" کا بھی پتہ چلتا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی کی اطلاع کے مطابق شہیار کا مجموعہ کلام جس میں ان کے والد شہوار کی بھی چند نظمیں شامل ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانہ خاص کی زینت ہے (۱۵)۔ اور تذکرۂ روسائے بنگن پلی کا قلمی نسخہ کتب خانہ قومی عجائب گھر کراچی (مخطوطہ نمبر ۲۵/ ۲۰۲ ۱۹۵۸ء) کا مخزونہ ہے۔ اس تذکرہ کا سنہ تالیف ۱۳۲۶ھ ہے اور اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"الحمد للہ رب العالمین ...... امابعد محی الدین شہیار ولد غلام حیدر شہوار ابن ملک محمود جوہر جس کے آباواجداد کو سرکار بنگن پلی سے نمک خواری واطاعت گزاری کا تعلق رہا ہے۔ عرض کرتا ہے کہ ......" (جائزہ اردو مخطوطات از مشفق خواجہ ص ۱۷۶)

مولوی افسر صدیقی امروہوی نے تذکرۂ روسائے بنگن پلی کو سہواً شہیار کے والد شہوار سے منسوب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "شہوار تاریخ روسائے بنگن پلی (غیر مطبوعہ) کے مصنف ہیں" (۱۶)۔ آگے چل کر وہ اطلاع دیتے ہیں کہ "شہوار کے لڑکے غلام محی الدین بھی شاعر تھے اور شہیار تخلص کرتے تھے ان کو ترک علی شاہ ترکی سے تلمذ تھا" (۱۷)۔

ملک محمود جوہر اور ان کے خاندان کے کسی شاعر کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ قیسی قمر نگری نے اپنے ایک مضمون "کرنول کا شعری سرمایہ" میں جوہر کی تاریخ وفات ۱۲۹۰ھ بتائی ہے (۱۸)۔ یہ اس لیے درست نہیں ہے کہ نقش حیدرآبادی کے تذکرے "عروس الاذکار" کی تالیف

(۱۲۸۹) سے قبل وہ وفات پا چکے تھے (۱۹)۔

جہاں تک مثنوی اشتیاق نامہ کا تعلق ہے۔ یہ ملک محمود جوہر کی ۱۶۸ ابیات پر مشتمل ایک مختصر مثنوی ہے۔ اس کے مطالعہ سے شاعر کے اظہار و بیان کی خصوصیات اور قادر الکلامی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اشتیاق نامہ از اوّل تا آخر شاعر کی اپنے محبوب سے جدائی کی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ محبوب کے ہجر و فراق میں شاعر اس کی صحبت میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحہ کو یاد کرتا ہے۔ ایام گزشتہ کی یاد اسے اپنے گل چہرہ معشوق سے دوبارہ وصال کے لیے اکساتی ہے۔ مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؂

غنچہ لب، گل عذار، سیمیں بر　　　لالہ رو، سرو قد، پری پیکر
شوق تیز اتو سکہ ہے مجھ کو　　　ماجرا اپنا کیا کہوں تجھ کو
دن تو حق میں مرے قیامت ہے　　　رات پھر کیا کہ ایک شامت ہے

آتش ہجر سے شاعر کا دل پگھل کر پانی ہو گیا ہے گویا اس کی آنکھوں سے کوہِ قاف رواں ہے ؂

آتش ہجر سے تری جانی　　　دل پگھل کر ہوا ہے اب پانی
نالے بہتے ہیں صاف چشموں سے　　　بہہ گیا کوہِ قاف چشموں سے

وصال محبوب کے اشتیاق میں کبھی وہ خواجہ حافظ کی فال دیکھتا ہے، کبھی پیروں کی منتوں میں سرگرداں رہتا ہے اور کبھی نجومیوں اور رمالوں سے اپنی قسمت کا حال دریافت کرتا ہے۔ محبوب کے چہرۂ زیبا اور بالوں کی لٹ سے لے کر پیروں تک جسم کے تمام اعضاء، لباس اور اشیائے آرائش و زیبائش کی خوبیوں کا بیان، شاعرانہ کمال کے ساتھ کرتا ہے۔ مثلاً چہرہ، پیشانی، ابرو، مژہ، چشم، بینی، خال رخسار، لب و دنداں، چاہ ذقن، در گوش، بالا، ٹیکا، نتھ، کاجل، دنبالہ، مسی، انگیا، کلائی، دستِ حنائی، نرم انگلیاں، سینۂ صاف، شکم، ناف، کمر، سرین، گھٹنے، ران، پنڈلیاں، بازو، پشواز، شلوار وغیرہ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؂

میری آنکھوں میں تیری صورت ہے　　　وہی پتلی سی ایک مورت ہے
جعد کا بس خیال ہے مجھ کو　　　زندگی ہی وبال ہے مجھ کو
زلف کا اف رے صاف بل کھانا　　　دل ہوا چاک چاک جوں شانہ
تیرے ابرو کا ہے خیال مجھے　　　عار ہے دیکھنا ہلال مجھے
واہ رے واہ اس مژہ کی جھپک　　　جس کے دیکھے سے پھر لگے نہ پلک
جب سے اس کا ہوا مجھے سودا　　　ہوئے وہ مجھ کو سوزنِ عیسیٰ (۲۰)

گردش چشم نے تیری ہر پل | شکل گرداب ، کردیا بے کل
یاد بینی کی اے بلند اختر | تیرے غم ناک کو ہے آٹھ پہر
تیرے منھ نے مجھے کیا ہے دنگ | آئینہ دیکھنا ہوا ہے ننگ
لب و دندان کا رنگ کیا کہیے | مونڈلے اپنے منھ کو چپ رہیے
تیرے چاہِ ذقن کی چاہ مجھے | کیا کہوں کس قدر ہے آہ مجھے
جب درِ گوش کا ترے ہو خیال | باولی طبع ہوتی ہے فی الحال
جب سے ٹیکا ترا نظر میں ہے | گوہر اشک چشم تر میں ہے
حلقۂ نتھ بھی ہے غضب تیرا | ناک میں آگیا ہے جی میرا
اور کاجل کا تیرا دنبالہ | کھٹکے آنکھوں میں جیسے سر والا
اسی کھٹکے نے یوں ستایا مجھے | آنکھ کا ، جل ہوا ڈوبایا مجھے
تیری انگیا کا کچھ عجب ہے رنگ | محرمِ راز بھی ہوا ہے دنگ
شوق سے اس کے ہاتھ کیوں نہ ملوں | جیوں انار آہ چاک سینہ ہوں

مثنوی اشتیاق نامہ میں شاعر نے ایک طرف سادگیٔ بیان اور روانی و برجستگی کا مظاہرہ کیا ہے تو دوسری طرف الفاظ کی تکرار اور رعایت لفظی سے اس میں صوتی آہنگ اور نغمگی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

یاد پیشانی کی تری جانی | مجھے اک اک گھڑی ہے پیش آنی
یاد کروہ کلائی ہات کی کل | نہ کل آئی مجھے رہا بے کل
تیرے گھٹنوں کے غم میں گھٹتا ہے | بھرے بلدار پیچ لگتا ہے
پاوں تیرے پیارے جب پاوں | اپنے دل کی مراد تب پاوں
یاد کر کرکے ہے یہ میرا حال | گزری اک اک گھڑی ہے سو سو سال

اشتیاق نامہ کی زبان تقریباً دو سو سال قدیم ہے لیکن اس دور کے دوسرے دکنی شعرا کے برخلاف جوہر کو زبان و بیان پر مکمل دستگاہ حاصل ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے جگہ جگہ خوب صورت تراکیب اور اضافتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ چند ترکیبیں اور اضافتیں ملاحظہ ہوں :

تراکیب : غنچہ لب۔ گل عذار۔ سیمیں بر۔ گل چہرہ۔ لالہ رو۔ پری پیکر۔ سرو قد۔ سر بہ زانو دل سوختہ۔ شوریدہ حال۔ محبت ضمیر۔ عرش جناب۔ بلند اختر۔ ہات کا پردہ۔ کرشمہ ادا۔ دوستاں شاد

اضافتیں : رشکِ صد بستاں۔ آتشِ ہجر۔ تشنۂ دیدار۔ خوابِ راحت۔ دورِ گردوں۔ ہندۂ خاکی ناوکِ ہجر۔ تودۂ طوفان۔ طائرِ دل۔ شکلِ قوس قزح۔ دامِ ہجر۔ کشتۂ ہجر۔ تیغِ ہجراں۔ دلِ ناشاد خالِ عارض۔ عرقِ رخ۔ گردشِ چشم۔ گوہر اشک۔ چاہِ ذقن۔ چشمِ تر۔ کوہِ غم۔ محرمِ رازو غیرہ۔

حواشی

(۱) تاریخ النوائط کے مولف نے ملک محمود کا تخلص جوآہر لکھا ہے۔ ص ۵۱۵۔
(۲) ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد سوم) ص ۲۲۱۔ (۳) ایضاً ص ۲۲۲۔
(۴) عروس الاذکار از نقش حیدر آبادی۔ مرتبہ افسر صدیقی۔ ص ۵۶
(۵) نصیر الدی ہاشمی۔ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات (جلد اوّل) ص ۴۰۔
(۶) ایضاً ص ۴۰ (۷) ایضاً ص ۴۳۔
(۸) عروس الاذکار مرتبہ افسر صدیقی۔ ص ۹۴۔ (۹) ایضاً ص ۲۱۴۔
(۱۰) ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد سوم) ص ۲۵۸۔
(۱۱)۔(۱۲)۔(۱۳) ایضاً ص ص ۲۵۸۔ (۱۴) ایضاً ص ۲۵۹۔
(۱۵) عروس الاذکار ص ۹۴۔ (۱۶)۔(۱۷) ایضاً
(۱۸) قیسی قمر نگری۔ کرنول کا شعری سرمایہ مشمولہ قومی زبان (حیدر آباد)۔ جنوری ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۵۔
(۱۹) عروس الاذکار۔ ص ۵۷۔
(۲۰) وہ سوئی جس کی بابت مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ کے دامن میں الجھی ہوئی آسمان پر چلی گئی تھی اور اس دنیوی چیز کے باعث وہ چوتھے سے آگے نہ جا سکے۔

کتابیات

(۱) ڈاکٹر زور۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد سوم و چہارم)
(۲) نصیر الدی ہاشمی۔ کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات
(۳) نصیر الدین ہاشمی۔ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات (جلد اوّل)
(۴) عروس الاذکار از نقش حیدر آبادی۔ مرتبہ افسر صدیقی امروہوی
(۵) مشفق خواجہ۔ جائزہ اردو مخطوطات (جلد اوّل)
(۶) عزیز جنگ۔ تاریخ النوائط۔

مخطوطات

(۱) مثنوی اشتیاق نامہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ مخطوطہ نمبر ۳۴۵۔ مثنوی۔
(۲) مثنوی اشتیاق نامہ مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ مخطوطہ نمبر ۴۶۳۔
(۳) مثنوی جوہر عشق مخزونہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو مخطوطہ نمبر ۶۰۱۔
(۴) دیوان جوہر مخزونہ کتب خانہ آصفیہ مخطوطہ نمبر ۱۶۲۹۔
(۵) دیوان شہوار مخزونہ کتب خانہ اصفیہ مخطوطہ نمبر ۱۶۳۲۔
(۶) دیوان شہوار مخزونہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو۔ مخطوطہ نمبر ۶۳۹۔
(۷) تذکرہ عطائے تمکین (عروس الاذکار) ادارۂ ادبیات اردو مخطوطہ نمبر ۸۹۲۔

علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ

دکنی اُردو کا ایک باکمال سخن ور

ابوالمظفر علی عادل نام، شاہیؔ تخلص ۔ مملکت بیجاپور کے مشہور حکمران جگت گرو ابراھیم عادل شاہ ثانی کا پوتا اور سلطان محمد عادل کا بیٹا تھا ۔ شاہیؔ ۱۲ / ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ مطابق ۲۷ / اگست ۱۶۳۸ء کو بروزِ جمعہ پیدا ہوا ۔ معجزؔ نامی شاعر نے درجِ ذیل شعر سے اس کی تاریخِ ولادت نکالی ہے :

ہاتفے از نہہ فلک از سرِ ذوق نشاط   مولدِ شہزادہ گفت "کوکبِ شوکت رسید" (۱)

۱۰۴۸ھ

محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد ملکہ خدیجہ سلطان اور دیگر ارکانِ سلطنت نے شہزادہ علی کو عادل شاہی خاندان کے آٹھویں حکمران کی حیثیت سے ۱۰۷۶ھ م ۱۶۶۵ء میں تختِ سلطنت پر متمکن کیا (۲) ۔ شاہیؔ نے بیجاپور کے علمی و ادبی ماحول میں آنکھ کھولی ۔ عادل شاہی خاندان کے ادب پرور روایات اور خدیجہ سلطان کی تربیت کی وجہ سے اس کے اندر شعر و سخن اور فنونِ لطیفہ کا اچھا ذوق پیدا ہوگیا تھا ۔ دادا (ابراہیم عادل شاہ ثانی) "جگت گرو" کے لقب سے مشہور ہوا تو پوتے نے اُستادِ عالم" کے نام سے مقبولیت حاصل کی ۔ شاہیؔ نے جس زمانہ میں عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں سنبھالی اس وقت بیجاپُور میں ہر طرف انتشار اور بغاوتوں کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے ۔ ایک طرف خود ملک کے سرکش امرا کی بغاوتیں اور فتنہ سامانیاں تھیں تو دوسری طرف مغلوں اور مرہٹوں کی سازشیں اور مکاریاں، لیکن کم سنی کے باوجود علی عادل شاہ ثانی نے تدبر اور ہمت کے ساتھ ان سب کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی ۔ شاہیؔ نے ۱۶۷۲ء میں ۳۵ سال کی عمر میں انتقال کیا ۔ بساتین السلاطین کے مولف نے اس

کی جواں مرگی کی وجہ بے اعتدالی اور حد سے بڑھی ہوئی عیش کوشی بتاتی ہے (۳)۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ شاہی کو دکنی زبان سے بے حد لگاؤ تھا اور اس زبان کی ترقی کے سلسلے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس کے عہدِ حکومت میں بیجاپور علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ بن گیا تھا۔ وہ علما، فضلا اور اہلِ قلم کا قدردان تھا اور خصوصاً شاعروں کی بہت عزت کرتا تھا۔ دکنی شعرا کی قدر افزائی اور سرپرستی کے سلسلے میں اس نے بڑی دریادلی کا مظاہرہ کیا۔ شاہی کے دربار سے وابستہ علما، مورخ اور شعرا میں شاہ ابوالمعالی، قاضی سید نور اللہ، علامہ فتح اللہ شیرازی، قاضی سید کریم اللہ، مولانا عبدالنبی، حکیم آتشی اور ملا نصرتی بہ طور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

شاہی کو فنِ تعمیر سے بھی دل چسپی تھی۔ اس نے دیگر عادل شاہی سلاطین کی طرح متعدد عمارتیں بنوائیں۔ جن میں اس کے پرشکوہ ناتمام مقبرہ کے علاوہ درجِ ذیل عالی شان محلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۱۔ حسینی محل اور مسجد (۱۰۶۷ھ)

۲۔ علی داد محل (۱۰۶۹ھ) ۳۔ عرش محل (۱۰۷۳ھ)

۴۔ بادشاہ محل (۱۰۸۱ھ) ۵۔ شرف برج (۱۰۸۰ھ)

علی عادل شاہ شاہی ایک قادر الکلام اور پرگو شاعر تھا۔ دکنی اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت کا میلان اپنی مادری زبان دکنی کی طرف زیادہ تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ چناں چہ اس نے بادشاہ محل اور شرف برج کی تعمیر کے موقع پر تاریخی قطعات بھی کہے ہیں۔

شاہی کی مطبوعہ کلیات میں چھ قصیدوں، تین مثنویوں، بیس غزلوں اور سولہ مرثیوں کے علاوہ ایک مخمس، ایک مثمن، ایک قطعہ، ایک رُباعی (۴)، ایک پہیلی اور تین فردیات کے پہلو بہ پہلو گیت، کبت، دوہرے اور جھولنا بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ چھ قصائد میں سے ابتدائی تین حمد و نعت اور منقبتِ حضرت علیؓ میں ہیں۔ حمدیہ قصیدہ کے ابتدائی چند اشعار ضائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ حالت میں یہ قصیدہ ۲۷/ ابیات پر محیط ہے۔ نعتیہ قصیدہ ۵۰/ اشعار پر مشتمل ہے اور اسی طرح منقبتی قصیدہ کے

اشعار کی تعداد بھی ۵۰ ہے۔ چوتھا قصیدہ بارہ اماموں کی منقبت میں لکھا گیا ہے جو ۱۶۵ اشعار پر ختم ہوتا ہے اور یہی شاہیؔ کا سب سے طویل قصیدہ ہے۔ پانچواں قصیدہ علی داد محل کی تعریف میں لکھا ہوا ہے جو ۶۵ / ابیات پر محیط ہے۔ یہ شاہیؔ کا دوسرا بڑا قصیدہ ہے۔ محلات کی تعریف و توصیف میں محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے بھی قصیدے سپردِ قلم کیے ہیں لیکن یہ قصیدے شاہیؔ کے اس قصیدے کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ شاہیؔ کا چھٹا اور آخری قصیدہ ایک محبوبہ کی تعریف میں ہے جس کے اشعار کی تعداد ۱۹ ہے۔

شاہیؔ دبستانِ بیجاپور کا ایک اہم قصیدہ نگار ہے۔ اس کے قصیدوں میں نصرتی کے قصائد کی طرح رفعتِ تخیل، شوکتِ لفظی، علوے مضامین، ندرتِ خیال، زورِ بیان اور جدتِ ادا سبھی کچھ موجود ہے۔ اس کے چھ قصیدوں میں سے ابتدائی چار شاعر کے مذہبی جذبات سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بے جا لفاظی اور مبالغہ کے بجائے بے ساختگی اور جذباتِ عقیدت و احترام کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان قصیدوں میں شاہیؔ نے اپنی شعری اور فن کارانہ صلاحیتوں کا بھی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

شاہیؔ کے ہاں قصیدۂ چرخیہ بھی ملتا ہے اور لامیہ بھی۔ اول الذکر قصیدے میں شاعر، چرخ یا آسمان سے متعلق الفاظ؛ تراکیب اور تشبیہات و استعارات کا اہتمام کرتا ہے اور آخر الذکر قصیدہ کے قوافی حرفِ لام پر ختم ہونے والے ہم وزن الفاظ پر مشتمل ہیں۔ اُردو میں سوداؔ اور محسنؔ کاکوروی کے لامیہ قصیدے بہت مشہور ہوئے۔ دکنی میں شاہیؔ کے علاوہ نصرتی اور غواصی کے لامیہ قصیدے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

شاہیؔ نے اگرچہ کہ صرف چھ قصیدے اپنی یادگار چھوڑے ہیں لیکن قلیل سرمایہ قصائد کے باوجود اس کو دکنی کے بلند پایہ اور باکمال قصیدہ نگاروں میں ایک امتیازی اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"شاہی کے قصیدوں کی نمایاں خصوصیت اس کا لطفِ تخیل ہے، جس کی مدد سے وہ احساس کی ایک خوب صورت تصویر بنا دیتا ہے۔ رواں بحروں کے ذریعہ وہ

خیال کی مجرد شکل کو نظر آنے والے اشیاء کی مدد سے اس طرح ابھارتا ہے کہ خود خیال ہمارے احساس کا حصّہ بن جاتا ہے۔۔۔۔ قصیدے کی روایت میں شاہیؔ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا" (۵)۔

کلیاتِ شاہیؔ میں تین مختصر مثنویاں بھی موجود ہیں۔ پہلی مثنوی "خیبر نامہ" ۲۷ / ابیات پر مشتمل ہے جس میں حضرت علیؓ کی فتح خیبر کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری مثنوی میں ۷ / ۷ / اشعار ہیں۔ ان مثنویوں میں محبوب کے حسن و جمال اور اس کے متعلقات کو تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کیا گیا ہے۔

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، شاہیؔ دبستانِ دکن کے چند ممتاز، صاحبِ دیوان متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی غزلوں کے مضامین و موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اپنے دادا جگت گرو کی طرح وہ بھی نغمہ و نشاط کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں سادگی اور برجستگی کے علاوہ حقیقت نگاری اور اپنے ماحول کی عکاسی کا رجحان بھی نمایاں ہے۔ اس کے کلام کا بیشتر حصّہ محبوب کے حسن و جمال، خد و خال اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے۔ شاہیؔ کی غزلیں زبان و بیان، اظہار و اسلوب کے نقطۂ نظر سے ایک منفرد حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کی تشبیہوں اور استعاروں میں بڑی تازگی، ندرت اور بانکپن کا احساس ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

تج گال پر نکہ کا نشاں دستا ہے مجہ اس دھات کا
روشن شفق میں جھمکے جیوں چاند پہلی رات کا

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیروں سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن، لاگیا نشاں تجہ بات کا

پھاندے کرے دو زلف گھنگروال کھبالے
مجہ نین پکھیرو کے بدل تل رکھے چارا

محمد قلی، غواصیؔ یا حسن شوقیؔ کے مقابلہ میں شاہیؔ کی غزل کی زبان کسی

قدر غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے اپنے کلام میں فارسی اور سنسکرت کے ادق الفاظ کو کھپانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے مترنم اور رواں بحروں کے التزام کے باوجود اس کے کلام میں اکھڑی اکھڑی سی کیفیت اور کھردرے پن کا احساس ہوتا ہے:

دیدم نظر بھر روپ جو اس شوخ چک مستانہ را
گفتم بیا مندر منے روشن بکن کاشانہ را
بھاگیرتی سو مانگ ہے سیس پھول برہمن
نت واں جھلک گیا سو دو تیرت کی گت کہوں

مذکورہ بالا رجحان کے برخلاف شاہی کی ریختیوں میں زیادہ دل کشی اور تاثر کی فراوانی نظر آتی ہے۔ اس کی ریختیوں میں ایک باوفا ہندوستانی عورت جلوہ گر ہے جو سایے کی طرح اپنے پیا کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ سجن کی دِل جوئی کرنا اور اسے رِجھانا ہی اس کا محبوب مشغلہ ہے:

سجن ملنے بلاویں جو چلوں گی پاؤں کر سیس سوں
پرت لاہوتے رہنے نہ پوچھوں گی کدھیں کس سوں
میں چھاؤں ہو پیا سنگ لاگی رہی ہوں دائم
یک پل جدا نہ ہونا وصلت اسے کہتے ہیں

حواشی:۔

(۱) سید مبارز الدین رفعت۔ کلیات شاہی۔ ص ۸۔

(۲) اس موقع پر مولانا ہلال نے بہ طریق تعمیہ ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا، جس کا مندرجِ ذیل مصرعہ بادشاہ کے سکہ پر بھی کندہ ہے: جانشین محمد است علی
۱۰۷۶

(۳) کلیاتِ شاہی۔ ص ۱۴۔

(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی نے انجمن ترقیِ اُردو کراچی کی ایک بیاض میں شاہی کی مزید چھ رباعیوں کی نشان دہی کی ہے۔ بہ حوالہ "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) مجلسِ ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء ص ۳۲۸۔ (۵) "تاریخِ ادب اُردو" (جلد اول) ص ۳۲۵۔۳۲۴۔

عہد عثمانی کا اردو ادب

حیدرآباد فرخندہ بنیاد، عہدِ قدیم ہی سے اردو زبان و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں فیروز، محمود اور خیالی دبستانِ گول کنڈہ کے اولین شعراء ہیں۔ یہ تینوں سخن ور ابراہیم قطب شاہ کے دور (۱۵۵۰ء۔ ۱۵۸۰ء) سے تعلق رکھتے ہیں۔ قطب شاہی سلاطین میں محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ صاحبِ سیف و قلم گزرے ہیں۔ جنہوں نہ صرف میدانِ کارزار میں اپنے کارہائے نمایاں انجام دیے، شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور قدردانی کی، بلکہ خود بھی دکنی اردو میں طبع آزمائی کی۔ مملکتِ گول کنڈہ کے پانچویں حکم ران سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ قطب شاہی دور کے دیگر شعرا اور ادیبوں میں وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی فائز، طبعی اور جنیدی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد، آصف جاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ آصف جاہی سلاطین نے سرزمینِ دکن پر تقریباً دو صدیوں تک حکم رانی کی۔ آصف جاہ، ناصر جنگ شہید اور نواب صلابت جاہ کے دور تک مملکت آصفیہ کا پایہ تخت اورنگ آباد رہا اور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں اورنگ آباد کی جگہ حیدرآباد کو دارالخلافہ بنایا گیا۔ آصف جاہی دور، تاریخِ دکن میں علوم و فنون اور شعر و ادب کے ارتقاء کے اعتبار سے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

نواب میر قمر الدین خاں آصف جاہ اول نے ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ ان کی زندگی کا بیش تر حصہ جنگ و جدال اور سلطنت کے استحکام میں گزرا لیکن شعراء، ادیبوں اور اہلِ کمال کی انھوں نے دل کھول کر سرپرستی اور ہمت افزائی کی۔ وہ خود بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ اس دور کے اردو شاعروں

ہیں درگاہ قلی خاں درگاہ، علی نقی خاں لسجاد اور مرزا داؤد کے نام اہمیت کے حامل ہیں
نواب ناصر جنگ شہید (۱۷۴۸ء ـ ۱۷۵۱ء) ناصر تخلص کرتے تھے ـ فارسی اور اردو کے علاوہ سنسکرت زبان پر بھی انھیں دست گاہ حاصل تھی ـ فارسی میں ان کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں ـ مختلف تذکروں میں ناصر جنگ کے اردو کلام کے نمونے بھی ملتے ہیں ـ اس دور کے نام ور اردو شعرا میں محمد ماہ محرم، عاشق علی خاں لمعا، عبدالحیٔ خاں صارم اور مولانا آزاد بلگرامی کے نام قابلِ ذکر ہیں ـ

نواب صلابت جاہ (۱۷۵۱ء ـ ۱۷۶۲ء) اپنے والد آصف جاہ اول اور بھائی ناصر جنگ کی طرح علم و ادب اور شعر و سخن کی سرپرستی کے سلسلے میں کافی شہرت رکھتے تھے ان کے عہد میں ایک طرف نوازش علی خاں شیدا نے "اعجاز احمدی" اور "روضتہ الاطہار"، "غلام قادر سامی" نے "سرو و شمشاد" اور سراج اورنگ آبادی نے "بوستان خیال" جیسی بلند پایہ مثنویاں قلم بند کیں تو دوسری طرف تذکرہ نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا چناں چہ حمید خاں نے اپنا تذکرہ "گلشنِ گفتار" افضل بیگ خاں قاقشال نے "تحفتہ الشعراء" اور خواجہ عنایت اللہ فتوت نے تذکرہ "ریاض حسینی" اسی دور میں مرتب کیا ـ

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۷۶۲ء ـ ۱۸۰۲ء) کے عہد میں آصف جاہی سلطنت کا صدر مقام اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا ـ جس کی وجہ سے یہ شہر ایک بار پھر علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ـ آصف جاہ ثانی اور سکندر جاہ (۱۸۰۲ء ـ ۱۸۲۸ء) کا دور حکومت اردو شعر و ادب کے فروغ کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ـ اس دور میں شعر و شاعری کے پہلو بہ پہلو تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی کی طرف باقاعدہ توجہ مرکوز کی گئی ـ منعم خاں ہمدانی مولف "سوانح دکن"، شاہ تجلی علی مولف "آصف نامہ"، لچھمی نرائن شفیق مولف "چمنستان شعرا"، وزیر میر عالم مولف "حدیقتہ العالم"، منشی قادر خاں بیدری مولف "تاریخِ دکن"، محمد فیض اللہ منشی مولف "خزانہ گوہر شاہ وار"، مرزا علی لطف مولف "گلشن ہند"، میر قمرالدین منت مولف "شکرستان"، شاہ کمال الدین مولف "مجمع الانتخاب" اس

دور کے نام ور مورخ اور تذکرہ نگار تھے۔

ناصر الدولہ آصف جاہ رابع (۱۷۹۴ء۔۱۸۵۷ء) کے عہد میں اردو شعر و سخن کے خوب چرچے ہوئے، مہاراجہ چندو لال شاداں کی سرپرستی کی وجہ سے شاہ نصیر دہلوی حسین علی لما اور دلاور علی خاں صفا جیسے باکمال سخن ور حیدرآباد میں داد سخن دے رہے تھے۔ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس (۱۸۵۷ء۔۱۸۶۹ء) کا دور شعر و ادب خصوصاً اردو نثر کے ارتقا کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں مختلف علوم و فنون جیسے ریاضی، فلسفہ، تاریخ، ہئیت، ہندسہ، کیمیا، طبعیات وغیرہ میں بے شمار کتابیں تصنیف کی گئیں اور اس کے پہلو بہ پہلو انگریزی علوم و فنون کی کتابوں کو بھی ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا گیا۔

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس (۱۸۶۹ء۔۱۹۱۱ء) کا عہد حکومت حیدرآباد میں شعر و ادب اور علوم و فنون کے نشو و نما اور ارتقا کے سلسلے میں ایک یادگار دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود بادشاہ وقت (میر محبوب علی خاں) کو نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ آصف تخلص کرتے تھے اور انھیں داغ دہلوی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کے دربار سے وابستہ شعرا میں ۔غ کے علاوہ جلیل مانک پوری اور امیر مینائی جیسے اساتذہ سخن و نیز مہاراجہ کشن پرشاد شاد نظم طباطبائی، حبیب کنتوری، ظہیر الدین ظہیر دہلوی اہمیت رکھتے ہیں۔ میر محبوب علی خاں کے دور میں شاعری اور نثرنگاری دونوں کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ قدردانی اور سرپرستی کی توقع میں شمالی ہند کے شعرا اور نثرنگار حیدرآباد کا رخ کرنے لگے۔ شمالی ہند سے حیدرآباد آنے والے انشاپردازوں میں عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، محسن الملک اور شبلی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں نثرنگاری کے میدان میں بعض حیدرآبادی مصنفین نے بھی بے مثال کارنامے انجام دیے ہیں۔ جیسے عبدالجبار خاں صوفی، مانک راؤ وٹھل راؤ، نواب عزیز جنگ ولا، انوار اللہ خاں فضیلت جنگ وغیرہ۔ نواب میر محبوب علی خاں کے دور کا ایک یادگار کارنامہ اردو کو سرکاری زبان بنانا ہے۔ ۱۳۰۱ھ میں انھوں نے ایک حکم نامے کے ذریعے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ جس کے نتیجے میں تمام دفاتر

کے کاروبار مکمل طور پر اردو میں انجام پانے لگے۔

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں کا دور (۱۸۶۹ء - ۱۹۶۷ء) دراصل یادگار دور ہے۔ یہ عہد مختلف علوم و فنون کے علاوہ اردو شعر و ادب کے نشو و نما کے سلسلے میں عہدِ زرین کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود آصف جاہ سابع نہ صرف ایک باکمال شاعر اور نثرنگار تھے بلکہ اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے بھی انھوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت میں نہ صرف اردو زبان کو ایک ادبی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے فروغ حاصل ہوا بلکہ ترقی یافتہ زبانوں کے علوم و فنون کو پہلی مرتبہ باقاعدہ اور منظم طریقے سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ اردو کے شہرہ آفاق اہلِ قلم شبلی نعمانی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی، ظفر علی خاں، نواب میر عثمان علی خاں کی سرپرستی اور قدر افزائی کے سبب اردو زبان و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک علم دوست حکمران کی حیثیت سے میر عثمان علی خاں نے ملک بھر کے مدرسوں، کالجوں اور جامعات کی سرپرستی کے علاوہ اردو کی انجمنوں اور بڑے بڑے اداروں کو بیش بہا امداد دی ہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد، دارالعلوم دیوبند، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، ندوۃ العلماء لکھنو، محبوب کالج سکندرآباد، جامعہ ملیہ دہلی، ڈومسٹک سائنس کالج دہلی وغیرہ۔

بہ قول مولوی نصیر الدین ہاشمی "اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے زمانے میں ۱۳۳۶ھ تک جن اربابِ علم کو ماہ وار مقرر ہوئی یا سابقہ ماہ وار میں اضافہ ہوا ان کی تفصیل یہ ہے:

> "مدیر پیسہ اخبار لاہور کو سالانہ ایک ہزار، تصانیف امیر خسرو کی طباعت کے لیے پندرہ ہزار، شفقت علی خاں شاہ جہاں پوری کو کتب کے سلسلے میں پانچ سو، عبدالرؤف صاحب شوق کو مثنوی "مرقع رحمت" کے لیے پانچ سو روپیہ یک مشت اور پانچ سو جلدوں کی خریداری کا حکم، سید سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ کی بیوہ کے

لیے پانچ سو کلدار، فرید احمد صاحب عباسی کو بہ صلہ تصنیف پانچ سو
بنگلور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائینس کو دس ہزار سالانہ، آل انڈیا
ایجوکیشنل کانفرنس کو سالانہ چھ ہزار تصانیف کے لیے یک مشت
ایک لاکھ اکہتر ہزار پانچ سو روپے، محب الحق صاحب بانکی پوری کو
پانچ سو یک مشت اور پچاس روپے ماہ وار، عبداللہ خاں صاحب کی
کتابوں کے لیے پانچ سو یک مشت، سید لیسین علی صاحب مصنف
تفسیر کو پچاس روپے ماہ وار، سید محمد حسین صاحب اغلب موہانی کو
تصنیفات کے صلے میں پچاس ماہ وار، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کو
پانچ سو ماہ وار، ظفر علی خاں کو چھ سو اور ان کے لڑکے اختر علی کو
ماہانہ دو سو روپے، عبداللہ خاں صاحب کسمنڈوی کو دو سو روپے ماہ
وار، انجمن ترقی اردو کو وضع اصطلاحات کے لیے سالانہ تیس ہزار
روپے کی امداد دی گئی (۱)۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام آصف جاہ سابع کے دور کا ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ نواب میر عثمان علی خاں نے ۱۹۱۸ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ ریاست حیدرآباد میں اردو یونی ورسٹی کے قیام کی ضرورت ایک طویل عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ لیکن یہ خواب آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اس وقت کے ہوم سکریٹری سر اکبر حیدری نے انگریزی زبان کو ذریعے تعلیم بنانے کے نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ریاستی وزیر تعلیم کو ۱۹۱۷ء میں ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی پرزور حمایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

(۱) اردو ہندستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

(۲) اردو ریاست حیدرآباد کی زبان ہے۔

(۳) یہ ایک آریائی زبان ہے اور ملک کی دوسری زبانوں سے اس کا قریبی رشتہ ہے اور

(۴) یہ ایک ایسی زبان ہے جو ریاست کی آبادی کے بہت بڑے حصے میں بولی اور

سمجھی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ اکبر حیدری نے اس بات پر زور دیا کہ یونی ورسٹی کی تعلیم کے ہر درجے میں انگریزی لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جانی چاہیے " (۲) ۔

اس یادداشت کو اس وقت کے وزیرِ تعلیم نے ۲۴/ اپریل ۱۹۱۷ء کو نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے دو دن بعد آصف سابع کی سال گرہ کے موقع پر ایک شاہی فرمان کے ذریعے عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا جس میں لکھا تھا کہ:

> " ریاست حیدر آباد میں ایک یونی ورسٹی کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے جس میں قدیم و جدید، مشرقی و مغربی فنون اور سائنس کی تعلیم کچھ اس انداز میں دی جائے کہ مروجہ تعلیم کے نقائص دور ہوں اور جسمانی، ذہنی اور روحانی نشو و نما کے تمام عصری طریقوں سے استفادہ ممکن ہو ۔ اس طرح کہ ایک طرف طلبا کو اعلیٰ سطح پر تعلیم و ریسرچ کے تمام مواقع حاصل ہوں اور دوسری طرف ہر طالب علم لازمی زبان کی حیثیت سے انگریزی میں بھی مہارت حاصل کرے ۔ میں بڑی مسرت کے ساتھ ریاست حیدر آباد میں میری تخت نشینی کی یادگار کے طور پر ایک یونی ورسٹی کے قیام کا حکم دیتا ہوں ۔ یہ یونی ورسٹی جامعہ عثمانیہ کے نام سے موسوم کی جائے گی " (۳) ۔

۲۲/ ستمبر ۱۹۱۸ء کے ایک اور شاہی فرمان کے بہ موجب نواب میر عثمان علی خاں اس جامعہ کے سرپرست اور صدرِ اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد چانسلر مقرر ہوئے ۔ ۱۹/ جون ۱۹۱۹ء کو جامعہ عثمانیہ کے مختلف عہدوں پر خدمات کے سلسلہ میں تقرارت عمل میں آئے اور ۲۸/ اگست ۱۹۱۹ء کو یونی ورسٹی کی مرکزی عمارت (آرٹس کالج) کا افتتاح عمل میں آیا ۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے ۔

عثمانیہ یونی ورسٹی چوں کہ ملک کی پہلی جامعہ تھی جس میں کسی دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا تھا ۔ اس لیے اس کے قیام کی تجویز پیش کرنے والوں کے

ذہن میں مختلف علوم و فنون جیسے سائنس، ٹکنالوجی، میڈیسن، انجینیرنگ وغیرہ کی کتابوں کی فراہمی اور ایک باضابطہ نظام تعلیم کی ترتیب و تشکیل کا تصور موجود تھا۔ اس مقصد کے لیے ۱۴/ اگست ۱۹۱۷ء کو سررشتہ تالیف و ترجمہ (Bureau of Compilations and Translations) قائم کیا گیا تھا جس کے کیوریٹر کی حیثیت سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتخاب عمل میں آیا۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ اور مجلس وضع اصطلاحات کے قیام کا مقصد صرف نصابی کتابوں کی فراہمی یا ترتیب و تالیف اور اشاعت نہیں تھا بلکہ مغربی علوم و فنون سے وسیع پیمانے پر استفادہ کرتے ہوئے تمام علوم سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا بھی تھا۔ چناں چہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> "اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعے سے دنیا کی اعلیٰ درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سمجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ، تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے" (۴)۔

سائنسی، سماجی اور علمی موضوعات پر عہد عثمانی سے قبل بھی تصنیف و تالیف کا کام ہوا ہے لیکن نواب میر عثمان علی خاں کے دور میں ان موضوعات پر نہ صرف سائنٹفک انداز میں کتابیں تصنیف کی گئیں بلکہ تعلیمی و تدریسی ضروریات کے پیش نظر مختلف علوم و فنون پر اردو زبان میں بہ کثرت کتابیں لکھی گئیں۔ جہاں تک اس دور کے شعر و ادب کا تعلق سے نواب میر عثمان علی خاں نے اردو شعرا اور نثرنگاروں کی سرپرستی اور قدرافزائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خود بادشاہ وقت (میر عثمان علی خاں) کو شاعری اور نثری نگاری دونوں سے دل چسپی تھی۔ وہ عثمان تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے عشقیہ اور مذہبی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور ان کا کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر زور:

"سلطان العلوم آصف جاہ سابع خود بھی شاعر ہیں لیکن علم و فضل اور مذہب کا پلہ بھاری ہونے کی وجہ سے ان کا کلام زیادہ تر عالمانہ اور مذہبی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اخباروں میں جو مضامین اور نوٹ شائع کیے ہیں وہ بھی بالعموم اصلاحی اور تنقیدی ہیں" (۵)۔

اس دور کے بہت سے شاعروں اور نثرنگاروں نے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے عہد میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور متعدد شعرا اور نثار ایسے بھی ملتے ہیں جنھیں عہدِ عثمانی میں اپنی علمی و ادبی اور فنی صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع ملا اور بے پناہ شہرت پائی۔ یہاں عہد عثمانی کے چند اہم شاعروں اور ادیبوں کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

امجد (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۶۱ء): سید امجد حسین امجد اس دور کے ایک قدر آور سخن ور تھے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی کا سایہ لڑکپن ہی میں ان کے سر سے اٹھ گیا تھا یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی والدہ کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ اور دارالعلوم حیدرآباد میں حاصل کی اور پنجاب کا امتحان منشی فاضل بدرجہ امتیاز کامیاب کیا۔ ۱۹۰۸ء کی طغیانی رودِ موسیٰ میں ان کی والدہ، اہلیہ، دختر اور سارے افرادِ خاندان بہہ گئے۔ صرف امجد ہی تن تنہا باقی رہ گئے تھے۔

امجد نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور غزلیں بھی لیکن ان کی شہرت اور نام وری کا دارومدار رباعی گوئی پر ہے۔ وہ اردو کے سب سے بڑے رباعی نگار سمجھے جاتے ہیں۔ امجد کی رباعیوں میں روحانی جذبات، عارفانہ کیفیات اور اخلاقی اقدار کا پرخلوص اظہار ملتا ہے۔ "ریاضِ امجد" (دو جلدیں) اور "رباعیاتِ امجد" (دو جلدیں) ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ امجد ایک باکمال سخن ور ہونے کے علاوہ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ شعری مجموعوں کے علاوہ نثر میں ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں (۶) جمالِ امجد، حجِ امجد، حکایاتِ امجد، گلستانِ امجد، خرقۂ امجد، مکتوباتِ امجد وغیرہ۔

صفی (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۵۴ء): صفی کا نام محمد بہاالدین تھا لیکن بہبود علی کے نام

سے مشہور ہوئے۔ اگرچہ کہ وہ اورنگ آباد کے متوطن تھے لیکن کم عمری کے زمانے میں حیدرآباد آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے ضیا گورگانی، ظہور دہلوی، فروغ حیدرآبادی اور رضی الدین حسن کیفی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا۔ صفی ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ شاعری کے فنی رموز سے بھی کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ غزل ان کی محبوب صنفِ سخن تھی۔ اسی صنف میں انھوں نے اپنی جدتِ طبع، زورِ کلام، لطفِ ادا، حسنِ بیان اور شیرینی زبان کے جوہر دکھائے۔ ان کے کلام میں سادگی و سلاست کا حسن پایا جاتا ہے۔ واقعیت اور اصلیت کے علاوہ ان کی شاعری میں صوفیانہ افکار کی حرارت بھی ہے اور معاملاتِ حسن و عشق کی نیرنگیاں بھی۔ ان کی اہمیت اور عظمت محض اس لیے نہیں کہ انھوں نے اردو غزل کو نئی آب و تاب اور توانائی بخشی بلکہ اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے استادِ سخن کی حیثیت سے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے فیضِ تربیت سے بہرہ یاب کیا۔ صفی کے کلام کی پہلی اشاعت ان کی وفات کے گیارہ سال بعد "انتخاب کلامِ صفی" کے نام سے عمل میں آئی اور پھر اس کے بعد "پراگندہ"، فردوسِ صفی"، "گلزارِ صفی"، کلام صفی اورنگ آبادی" اور "خمریاتِ صفی" کے نام سے ان کے مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پر آئے۔

جلیل مانک پوری (۱۸۶۲ء - ۱۹۴۶ء): جلیل مانک پور کے ایک متوسط علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۲ سال کی عمر میں قرآنِ حکیم حفظ کیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد حافظ عبدالکریم سے حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ اپنے وقت کے مشہور استادِ سخن حضرت امیرمینائی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ایک عرصے تک امیرمینائی کے ساتھ رام پور میں مقیم رہے ۱۹۰۰ء میں انھیں کے ہم راہ حیدرآباد پہنچے اور یہیں کی خاک کا پیوند بنے۔ شاہانِ دکن نواب میر محبوب علی خاں آصف اور میر عثمان علی خاں عثمان کے استادِ سخن بننے کا اعزاز پایا۔ "استاد السلطان"، "جلیل القدر" اور "فصاحت جنگ" کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔

جلیل نے کم و بیش تمام اصنافِ سخن کو اپنی طبع کا موضوع بنایا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر علی احمد جلیلی "اشعار فصاحت و

بلاغت کا مرقع ہیں اور اعلیٰ درجے کی کلاسیکیت رکھتے ہیں ۔ اساتذہ لکھنو کا اثر صاف نمایاں ہے ۔ در حقیقت یہ وہی کلام ہے جو جلیل کو استادوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے متانت، سنجیدگی، بلند خیالی، معنی آفرینی اور محاورات کی کثرت ہے" (۷) ۔

فصاحت جنگ جلیل نے "تاجِ سخن"، "جانِ سخن"، اور "روحِ سخن" کے نام سے غزلوں کے تین دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں ۔ ان کی نثری تصانیف میں "تذکیر و تانیث"، "معیارِ اردو"، "اردو کا عروض" اور "سوانح امیر مینائی" کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ حضرت جلیل کا حلقہ۔ تلامذہ کافی وسیع تھا ۔ شاہانِ دکن، شہزادگان و صاحب زادگان اور امرائے پائے گاہ، سلطنت کے علاوہ سینکڑوں شعراان کے حلقہ۔ تلامذہ میں شامل تھے ۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے اپنی کتاب "فصاحت جنگ جلیل" میں ۲۷۰ شاگردانِ جلیل کی فہرست دی ہے (۸) ۔

میکش (۱۹۱۶ء ۔ ۱۹۴۸ء): صاحب زادہ میر محمد علی میکش خانوادہ آصف جاہی کے چشم و چراغ اور جامعہ۔ عثمانیہ کے قابلِ فخر سپوت تھے ۔ زمانہ۔ طالب علمی ہی سے ان کی ادبی اور شعری صلاحیتیں نمایاں ہونے لگی تھیں ۔ ان کے ابتدائی دور کے کلام میں عشقیہ مضامین و موضوعات کے ساتھ ساتھ عہدِ اضطراب کی ترجمانی بھی ملتی ہے ۔ اور پھر جوں جوں ان میں ترقی پسند تصورات کا شعور بڑھتا گیا تو وہ ترقی پسند نظریات کے علم بردار بن گئے ۔ میکش بیک وقت شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، انشا پرداز بھی تھے اور نقاد بھی، ڈراما نویس بھی تھے اور مزاح نگار بھی ۔ لیکن ان کی شہرت کا دار و مدار نثر نگاری پر نہیں بلکہ شاعری پر ہے ۔ میکش نے اپنی شاعری کے تین مجموعے "گریہ و تبسم"، "نوید" اور کھوئے ہوؤں کی جستجو" یادگار چھوڑے ہیں ۔ بعد کو اول الذکر دو مجموعہ ہائے کلام کی منتخب منظومات پر مشتمل شعری مجموعہ "میخانہ" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے ۔ جس میں ان کے مطبوعہ کلام کے علاوہ غیر مطبوعہ تخلیقات بھی شامل ہیں ۔ جہاں تک میکش کی نثر نگاری کا تعلق ہے ان کے متعدد مضامین اور مقالے ملک کے بیشتر علمی و ادبی رسائل میں بکھرے پڑے ہیں ۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" چھپ چکا ہے ۔

نظم طباطبائی (۱۸۵۲ء ۔ ۱۹۳۳ء): علی حیدر نظم طباطبائی لکھنو کے متوطن

تھے۔ ایک عرصے تک انھوں نے کلکتہ میں قیام کیا تھا۔ ۱۳۵۲ھ میں نواب واجد علی شا
کی وفات کے بعد حیدرآباد چلے آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابتدا گو
کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم اور بعد کو کو نظام کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔
دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بھی خدمات انجام دیں۔ نظم بیک وقت شاعر بھی تھے او
نثرنگار بھی۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر غیر معمولی عبور حاصل تھا
بہ قول ڈاکٹر زور:

"فضل و کمال اور شعر و سخن میں مسلم الثبوت استاد تھے۔ عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں شرح دیوان غالب، شرح تشریح الافلاک، تعریف نحو، بینات، معربات، تحقیق لون و شعاع، مثنوی شقشقیہ اور دیوان صوت تغزل مطبوعہ اور مشہور ہیں (۹)۔

مخدوم (۱۹۰۸ء - ۱۹۶۹ء): مخدوم محی الدین ضلع میدک کے ایک گاؤں
پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد گورنمنٹ
سٹی کالج حیدرآباد میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اپنی آزاد خیالی اور انقلابی نظریا
کی وجہ سے ملازمت ترک کر کے عوامی اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ ا
سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مخدوم نے کمیونسٹ
پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے متعدد ممالک کا دورہ بھی کیا۔ انھوں نے کمیونزم
اشتراکیت کا محض نظریاتی طور پر پرچار ہی نہیں کیا بلکہ عملی طور پر کسانوں، مزدور
اور محنت کشوں کے ساتھ کام بھی کیا تھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں ذاتی تجربات
احساسات کی حرارت اور دمک ملتی ہے۔ کسان، مزدور، روٹی، بھوک اور سمف
جیسے اہم مسائل ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری کے تین مجمو
"سرخ سویرا"، "گل تر" اور "بساط رقص" شائع ہو چکے ہیں۔

وجد (۱۹۱۴ء - ۱۹۸۴ء): سکندر علی وجد اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ ابتد
تعلیم اورنگ آباد ہی میں حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کیہ
حیدرآباد سیول سروس کے لیے منتخب ہوئے، عدلیہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے

بمبئی میں سشن جج کی حیثیت سے ملازمت سے سبک دوش ہوئے ۔ وجد نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں ۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں بڑی نفاست نظر آتی ہے ۔ ان کی نظموں کے موضوعات میں قدرتی مناظر، واردات عشق، سیاسی مسائل، فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے سبھی کچھ شامل ہیں ۔ ان کے کلام کے مجموعوں میں "لہو ترنگ"، "آفتاب تازہ"، "اوراق مصور" اور "بیاض مریم" شامل ہیں ۔

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اس دور کے دیگر سخن وروں میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد، محمد علی مسرور، جلال الدین توفیق، رضی الدین حسن کیفی، نواب تراب یار جنگ سعید، نواب عزیز یار جنگ عزیز، محمد حبیب الدین صغیر، عبد القدیر حسرت، محمد حسین آزاد، رگھویندر راؤ جذب، راجہ محبوب راج محبوب، عبد القیوم باقی، جلال الدین اشک، صمد رضوی ساز، علی اختر، تمکین سرمست، علی منظور، خورشید احمد جامی اور سلیمان اریب وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

شعر و سخن کے پہلو بہ پہلو، اردو نثر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں بھی عہد عثمانی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے ۔ ذیل میں اس دور کے چند اہم نثرنگاروں کا اجمالی تعارف کروایا جارہا ہے ۔

غلام صمدانی خاں گوہر: گوہر نثرنگار بھی تھے اور شاعر بھی "نظم گوہر" کے نام سے ان کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے ۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار "جلوۂ محبوب" کے ایڈیٹر اور ایک ناول "صادق و رحیم النسا" کے مصنف بھی تھے ۔ ان کی دیگر مرتبہ اور مولفہ کتابوں میں "ریاض آصف" اور دو جلدوں پر مشتمل حیدرآباد کی ضخیم ادبی تاریخ "تزک محبوبیہ" اور "دربار آصف" کے نام قابل ذکر ہیں ۔

راجیشور راؤ اصغر: اصغر کو بھی اس دور کے بیش تر مصنفین کی طرح نثرنگاری اور شاعری دونوں سے دل چسپی تھی ۔ اردو اور فارسی میں ان کی ۳۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں (۱۰) ۔ فن لغت اور زبان ان کے خاص موضوعات تھے ۔ اصغر کی مرتبہ اور مولفہ کتابوں میں "نجم اللغات"، "مفتاح اللغات"، "افسر اللغات"، "فرہنگ فارسی جدید"، "مجمع الالفاظ"، "مجموعہ ضرب الامثال" اور "القاموس الجدید" کے نام قابل

ذکر ہیں۔

عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۲۶ء): صوفی مدرسہ اعزہ حیدرآباد میں درس وتدریس کی خدمات پر مامور تھے۔ مورخ اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں اگرچہ کہ ان کی تحریریں رطب و یابس سے خالی نہیں ہوتیں۔ عبدالجبار خاں صوفی کے مرتبہ تذکروں "تذکرہ اولیاءِ دکن" (دو جلدیں)، "تذکرہ شعراءِ دکن" (دو جلدیں) اور "تذکرہ سلاطینِ دکن" میں آصف جاہی دور کے حیدرآباد کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ محفوظ ہو گئی ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۵۳ء): بنیادی طور پر ایک مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ تھے۔ ان موضوعات پر انھوں نے اعلیٰ پایہ کی کتابیں سپردِ قلم کی ہیں۔ مختلف رسائل میں ان کے متعدد علمی، ادبی سوانحی اور تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ قادری صاحب کو دکنی زبان و ادب اور تحقیق سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کی کتاب "اردوئے قدیم" دکنی زبان و ادب پر پہلی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۴۷ء): ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد رشید تھے۔ وہ بیک وقت طنز و مزاح نگار بھی تھے اور سوانح نویس بھی، محقق و نقاد بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ وہ علم و ادب کے شگفتہ ذوق اور مزاح نگاری میں بے مثل تھے۔ دلی کا آخری مشاعرہ اور نذیر احمد اور وحید الدین سلیم کی کہانیاں ان کے شاہ کار سمجھے جاتے ہیں (۱۱)۔

وحید الدین سلیم (۱۸۶۷ء۔ ۱۹۲۸ء): عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کے پہلے پروفیسر، بلند پایہ ادیب اور باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ میں علم و ادب اور تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تالیف "وضعِ اصطلاحات" اپنے موضوع پر واحد گراں قدر تصنیف ہے۔ وحید الدین سلیم کے تحقیقی مضامین و مقالات کا ایک مجموعہ "افاداتِ سلیم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے ہیں۔

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔ ۱۹۶۱ء): بابائے اردو مولوی عبدالحق ابتداً دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ناظم اور بعد کو وحید الدین سلیم کے انتقال کے بعد

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو کے معتمد رہے۔ جب تک وہ حیدرآباد میں رہے انجمن کا دفتر یہیں کام کرتا رہا۔ ان کی کوششوں سے متعدد کتابیں انجمن کی جانب سے شائع ہوئیں۔ تحقیق و تدوین، تبصرہ و تنقید، لغت و قواعد اور دکنیات جیسے موضوعات پر ان کی متعدد تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ سب رس، ادبی تبصرے، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، قطب مشتری، چند ہم عصر مرحوم دہلی کالج، نصرتی ملک الشعراء بیجاپور۔

ڈاکٹر زور (۱۹۰۴ء - ۱۹۶۲ء): سید محی الدین قادری زور نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم لندن اور فرانس میں حاصل کی اور پھر حیدرآباد واپس ہونے کے بعد جامعۂ عثمانیہ ہی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کا شمار اس جامعہ کے ان نام ور فرزندان میں ہوتا ہے جنھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ وہ بہ یک وقت بلند پایہ محقق، صاحبِ بصیرت نقاد، ماہر دکنیات و لسانیات بھی تھے اور شاعر و افسانہ نگار بھی۔ اردو زبان و ادب کی بقا اور ترویج و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے متعدد بیش بہا خدمات انجام دی ہیں لیکن ادارۂ ادبیات اردو کا قیام ان کی زندگی کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر زور کی علمی و ادبی فتوحات اور ان کی کامیابی و کامرانی میں ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا بلکہ اپنے اطراف اردو کے بے لوث خدمت گذاروں کا ایک وسیع حلقہ بھی بنا لیا تھا۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے چار درجن کے قریب کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ، اردو شہ پارے، روحِ تنقید، اردو کے اسالیب بیان، تذکرہ اردو مخطوطات (۵ جلدیں) ہندستانی لسانیات۔

پروفیسر سروری (۱۹۰۶ء - ۱۹۷۱ء): عبدالقادر سروری جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ ابتداً وہ اسی جامعہ میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد کو میسور یونی ورسٹی اور کشمیر یونی ورسٹی میں بہ حیثیت

پروفیسر اور صدر شعبہ کارگذار رہے۔ سروری صاحب ادارۂ ادبیات اردو کے سرگرم کارکن اور ڈاکٹر زور کے دست راست تھے۔ وہ نہ صرف محقق و نقاد اور افسانہ نگار و انشاپرداز تھے بلکہ ماہر لسانیات اور ماہر دکنیات بھی تھے۔ مذکورہ موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "پھول بن"، "اردو مثنوی کا ارتقا"، "جدید اردو شاعری"، "دنیائے افسانہ"، "کردار اور افسانہ"، "کلیات سراج"، "اردو کی ادبی تاریخ" ان کی چند کتابوں کے نام ہیں۔

مولوی سید محمد (۱۹۰۶ء – ۱۹۷۶ء): سید محمد صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کا امتحان بدرجہ امتیاز کامیاب کیا تھا۔ بعد ازاں وہ اسی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں بہ حیثیت استاد خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی پہلی تصنیف "ارباب نثر اردو" سے ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ ان کی مرتبہ اور مولفہ دیگر کتابوں میں "مثنویات میر"، "دیوان عبداللہ قطب شاہ"، "گلشن گفتار"، "یادگار ولی" اور "گلشن عشق" قابل ذکر ہیں۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی (۱۸۹۵ء – ۱۹۶۴ء): ہاشمی صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی بعد کو انھوں نے مدراس یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان بھی کامیاب کیا تھا۔ دفتر دیوانی و مال اور سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں خدمات انجام دیں۔ محقق اور ماہر دکنیات کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تقریباً تین درجن کتابیں تصنیف کیں۔ چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

"دکن میں اردو"، "دکنی ہندو اور اردو"، "یورپ میں دکنی مخطوطات"، "مقالات ہاشمی"، "خواتین عہد عثمانی"، "مدراس میں اردو"، "دکنی کلچر"، "کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست"، "کتاب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست" (دو جلدیں)۔

مذکورہ بالا مصنفین کے علاوہ عہد عثمانی میں متعدد اہل قلم نے نثری کارنامے انجام دیے ہیں لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے یہاں چند اہم نثاروں کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں:

اصغر علی بلگرامی، عظمت اللہ خاں، عزیز احمد، آغا حیدر حسن، حافظ محمد مظہر، میر ولی الدین، محشر عابدی، غلام یزدانی، عبدالمجید صدیقی، سعادت علی رضوی، ہارون خاں شروانی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، شیخ چاند، رشید قریشی، تمکین کاظمی، ابراہیم جلیس، میر حسن، اشفاق اللہ وغیرہ۔

حواشی:

(۱) دکن میں اردو (بیورو ایڈیشن ۱۹۸۵ء) ص ۵۵۰۔ ۵۵۱۔

(۲) ارمغان جشن الماس جامعہ عثمانیہ۔ ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۰۔

(۳) ایضاً۔

(۴) دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ از مجید بیدار، بہ حوالہ ارمغان جشن الماس۔ ص ۲۲۲۔

(۵) ڈاکٹر زور۔ داستانِ ادب حیدرآباد۔ ص ۱۷۸۔

(۶) ایضاً ص ۱۸۲۔

(۷) ڈاکٹر علی احمد جلیلی۔ فصاحت جنگ جلیل۔ ص ۲۳۰۔

(۸) ایضاً ص ۱۴۳۔ ۱۴۸۔

(۹) ڈاکٹر زور۔ داستانِ ادب حیدرآباد۔ ص ۱۷۸۔

(۱۰) ایضاً ص ۱۷۴۔

(۱۱) نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ ص ۷۴۶۔ ۷۴۷۔

○ ○ ○

تہنیت النساء بیگم اور ان کی نعتیہ شاعری

محترمہ تہنیت النسا بیگم تہنیت مشہور محقق اور ماہر لسانیات و دکنیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی شریک حیات اور اردو کی ایک باکمال نعت گو شاعرہ تھیں۔ شاعری کا ذوق انھوں نے ورثے میں پایا تا۔ ان کے چچا سر نظامت جنگ بہادر اپنے وقت کے ایک نام ور ماہر سیاسیات ہونے کے علاوہ انگریزی کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ انھوں نے میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ محترمہ تہنیت کی دو پھوپھیاں خیر النسا بیگم خیر اور زینت النسا بیگم ساجدہ اردو میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ خود ان کے شوہر ڈاکٹر زور محقق و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ادبی ذوق کو مزید نکھرنے سنورنے کا موقع ملا۔ تہنیت صاحبہ نے نعتیہ شاعری کے تین مجموعہ ہائے کلام "ذکر و فکر"، "صبر و شکر"، "تسلیم و رضا" اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں سب رس کتاب گھر رفعت منزل حیدرآباد کی جانب سے علی الترتیب ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ حیدرآباد کے علمی و مذہبی اور ذی ثروت گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کا ددھیالی سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ ننھیالی سلسلہ ایک طرف حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ملتا ہے تو دوسری طرف علماء فرنگی محلی سے بھی قرابت قریبہ رکھتا ہے۔ ان کی والدہ ہندستان کے مشہور عالم مولانا عبد الباری فرنگی محل کی ماموں زاد بہن تھیں۔ بہ قول پروفیسر آغا حیدر حسن "حضرت مولانا (عبد الباری فرنگی محلی) کے دربار سے گاندھی جی کو مہاتما کا خطاب ملا تھا اور پوری دنیا میں باپو مہاتما مشہور ہو گئے۔ مولانا محمد علی نے اسی دربار میں دست بیعت دراز کیا تھا اور مسٹر سے مولانا ہو گئے" (۱)۔

تہنیت صاحبہ کے والد نواب رفعت یار جنگ ثانی مملکت آصفیہ میں بیدر اور اورنگ آباد میں صوبے داری کے عہدے پر فائز تھے۔ان کی والدہ محترمہ اسما بیگم صاحبہ مدینہ منورہ میں تولد ہوئی تھیں اور نو سال کی عمر میں، اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ ہندستان آئیں اور تقریباً ربع صدی تک یہاں قیام پذیر رہنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں اپنے پیدائشی مقام مدینہ منورہ ہجرت کر گئیں۔۱۹۵۲ء میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔مدینہ منورہ ہی میں تدفین عمل میں آئی۔

محترمہ تہنیت ۲۵/ مئی ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ اسما بیگم سے حاصل کی اور پھر بعد ازاں انھیں حیدرآباد کی مشہور درس گاہ محبوبیہ گرلز ہائی اسکول میں شریک کروایا گیا۔جہاں انھوں نے سینئیر کیمرج تک تعلیم حاصل کی۔تہنیت صاحبہ کے تین بھائی غازی الدین احمد، ناصرالدین احمد، سراج الدین احمد اور تین بہنیں رفعت النسا بیگم، عظمت النسا بیگم اور لیاقت النسا بیگم تھیں۔ان کے بڑے بھائی غازی الدین احمد انگریزی کے اور ناصرالدین احمد ناصر اردو کے اچھے شاعر تھے (۲)۔اور چھوٹے بھائی سراج الدین احمد محکمۂ سیل ٹیکس میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔انھوں نے آخر عمر تک ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مجلسِ انتظامی کے رکن اور شعبۂ امتحانات کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ۱۵/ نومبر ۱۹۳۲ء کو مشہور واعظِ دکن حافظ سید شاہ محمد قادری زعم کے فرزندِ ارجمند سید محی الدین قادری زور سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ان کے شوہر کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ شیخ علی سانگڑے سلطان مشکل آسانؒ (متوفی ۸۴۶ھ) تک پہنچتا ہے۔حضرت سانگڑے سلطان، حضرت سید احمد کبیر رفاعی کے بڑے فرزند اور اپنے وقت کے ایک جید عالم اور صاحبِ باطن بزرگ تھے۔تہنیت النسا بیگم کی خوش دامن صاحبہ محترمہ بشیر النسا بیگم حضرت مولانا انوار اللہ شاہ فضیلت جنگ بانیِ جامعۂ نظامیہ، حیدرآباد کی قرابت دار تھیں۔نواب فضیلت جنگ آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کے عہدِ حکومت میں سررشتۂ امور مذہبی میں وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز تھے۔

تہنیت النسا بیگم کے شوہر نام دار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۱۹۰۴ء۔

۱۹۶۲ء) کی ادبی شخصیت ان کی غیر معمولی خدمات کی وجہ سے تاریخِ ادب اردو میں ایک درخشاں ستارے کی طرح جگمگاتی رہے گی۔ وہ نہ صرف ایک صاحبِ نظر نقاد، بلند پایہ محقق اور ماہر لسانیات تھے بلکہ دکنی ادب کے نامور مورخ اور باکمال افسانہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے اپنی بے پناہ تحقیقی و تنقیدی اور تدریسی و تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعے کم و بیش چار دہوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دی۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی تاسیس ڈاکٹر زور کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اس ادارے کا قیام ڈاکٹر زور کے علاوہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مولوی عبدالقادر، مولوی نصیرالدین ہاشمی اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے رقمی عطیوں سے ۱۹۳۱ء میں درج ذیل اغراض و مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا:

(۱) اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت

(۲) سرزمین دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا۔

(۳) ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا۔

(۴) عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

(۵) اردو کو غیر اردو داں اشخاص سے روشناس کرانا۔

(۶) تاریخ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی ادب و آثار کی حفاظت۔

(۷) ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ خواتین کے لیے وقف رہے (۳)۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ادارے کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس کے سارے کاروبار "تہنیت منزل" کے ایک کمرے ہی میں انجام پاتے تھے۔ جب اس کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوا اور کتابوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی تو زور صاحب نے اپنے گھر کے قریب تین چار کمروں اور ایک ہال پر مشتمل ایک عمارت تعمیر کروائی اور ادارے کو اس میں منتقل کر دیا۔ ۱۹۴۱ء سے انھوں نے ادارے کے لیے زمین اور عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں باقاعدہ جستجو شروع کر دی تھی۔ حکومت کی جانب سے عمارت بنوانے

کے لیے سالانہ گرانٹ بھی منظور ہوئی تھی لیکن ایک عرصے تک وہ زمین کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکے ۔ حکومتِ حیدرآباد کی طرف سے منظورہ رقم کے منسوخ ہوجانے کا اندیشہ درپیش تھا ۔ ایسے نازک موقع پر محترمہ تہنیت النسا بیگم نے اپنے مکان سے متصل ۴۰۰ گز پر مشتمل پلاٹ کو ادارے کے لیے تحفتاً رجسٹری کرواکے اپنے شوہر کے دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنانے کی راہیں آسان کردیں ۔ ۱۹۴۶ء میں خواجہ حسن نظامی نے اس عمارت کے لیے "ایوانِ اردو" کا نام تجویز کیا تھا ۔ اس عمارت کا نقشہ بہزادِ دکن فیاض الدین نظامی نے ۱۹۵۵ء میں تیار کیا ۔ ۱۹۵۹ء میں بی رام کشن راؤ چیف منسٹر آندھراپردیش نے "ایوانِ اردو" کا سنگِ بنیاد رکھا ۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر زور کے انتقال سے تقریباً دوسال قبل وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد نے اس کا افتتاح کیا ۔ بہ قول سید رفیع الدین قادری "ایوانِ اردو کی عمارت کے نقشے سے لے کر اس کی تعمیر وتزئین اور آرائش و زیبائش تک سب کام محترمہ تہنیت النسا بیگم صاحبہ کے حسبِ منشا ہوئے ۔" ادارے کی مختلف سرگرمیوں اور اس کے مختلف شعبوں سے بیگم زور کی عملی وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور کی صاحب زادی تہذیب یحییٰ فاروقی صاحبہ لکھتی ہیں:

> "پردہ میں رہ کر آپ نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ہر طرح خدمت انجام دی ۔ تمام سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں ۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبہ خواتین کی سرگرم رکن رہیں ۔ ادارے کی جانب سے "اردو دانی اور اردو زبان دانی" وغیرہ کے جو امتحانات بلدہ و اضلاع میں منعقد کیے جاتے تھے ، خواتین کے امتحانی مراکز کی نگرانی اپنی بہن عظمت النسا بیگم ہمشیرہ ڈاکٹر فراست شاہد وغیرہ سے مختلف مقامات پر انتظامات کرواتی تھیں" (۴) ۔

ڈاکٹر زور اپنے علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی اور تدریسی و تنظیمی امور میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ دن بھر کی معروفیات کے باوجود انھیں رات دیر گئے تک پورے انہماک اور یک سوئی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا ۔ محترمہ تہنیت بھی نہ صرف رات رات بھر جاگتی رہتی تھیں بلکہ ان کے کام میں ہاتھ بھی بٹاتی تھیں ۔ بہ قول سید رفیع

الدین قادری "والد صاحب کوئی بھی کام والدہ سے مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب بھی کوئی مضمون تحریر کرتے یا کتاب لکھتے تو اس کا مسودہ پہلے والدہ صاحبہ کو دکھاتے اور وہ مسودہ دیکھنے کے بعد انھیں مشورے بھی دیا کرتیں" (۵)۔

محترمہ تہنیت ایک اطاعت گزار، فرماں بردار اور شوہر پرست بیوی تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتی تھیں۔ محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی کا بیان ہے کہ:

"بابا کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ آرام کا (اتنا) لحاظ کہ جب وہ سو رہے ہوں ہم لوگ شور نہ کریں۔ ان کے کھانے پینے کا پہننے کا ان کے اوقات کی پابندی کا۔ جب کالج سے شام واپس آتے تو نوکر چاکر ہونے کے باوجود خود اپنے ہاتھ سے چائے کے ساتھ کوئی میٹھی چیز بنا کر رکھتیں۔ اس امر کا خاص خیال رکھتی تھیں کہ کوئی بات انھیں ناگوار نہ گزرے اور خود وہ کام یا بات نہ کرتیں جو انھیں ناپسند ہو"

(۶)۔

ڈاکٹر زور کی علمی و ادبی فتوحات میں بیگم زور کا بھی حصہ رہا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر زور کو بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر گھریلو مسائل سے بڑی حد تک مستغنی کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے ڈاکٹر زور نے ایک مختصر سے عرصے میں بہ حیثیت محقق و نقاد اور ماہر لسانیات و دکنیات، تن تنہا جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ کئی انجمنوں اور اداروں کی جانب سے کیے جانے والے کام پر بھی بھاری ہیں۔ تصنیف و تالیف کے کام اور دیگر مصروفیات کے سلسلے میں قاضی عیاذ انصاری کے ایک استفسار پر ڈاکٹر زور نے اپنی شریک حیات کا بہ طور خاص تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ "دن رات میں لکھنے پڑھنے کے سوا کسی اور معاملے کو کبھی دخل نہیں رہا اور اس کے لیے میں اپنی بیوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے سارے گھریلو کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے علمی و ادبی کاموں میں بھی انھوں نے میرا دور دور تک ہاتھ بٹایا ہے" (۷)۔

تہنیت النسا بیگم صاحبہ ایک وفاشعار اور سلیقہ مند بیوی ہونے کے ساتھ

ساتھ ایک صابر و شاکر خاتون بھی تھیں۔ ایک دولت مند گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ بے جا اصراف اور غیر ضروری شان و شوکت کی قائل نہیں تھیں۔ انھوں نے اپنے شوہر سے کبھی زیورات یا قیمتی ملبوسات کی فرمائش نہیں کی۔ ڈاکٹر زور نے "تہنیت منزل" کی عمارت زیادہ صرفے کے بغیر کچھ اس انداز سے تعمیر کروائی تھی اور بیگم زور نے اسے کچھ اس طرح آراستہ کیا تھا کہ دیکھنے میں یہ عمارت کافی وسیع و کشادہ محل کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی عمارت کی تعمیر سے پہلے ادارے کی ساری علمی و ادبی سرگرمیاں اور مشاعرے "تہنیت منزل" ہی میں منعقد ہوتے تھے۔ ان ساری تقاریب میں بیگم زور کے گھر کا قیمتی فرنیچر اور برتن استعمال ہوتا تھا اور ان ساری تقریبوں کے انتظامات بھی وہ خود کرتی تھیں۔

تہنیت النسا صاحبہ نے شہرت و مقبولیت اور نام و نمود سے پرے رہ کر ناقابلِ فراموش سماجی، فلاحی اور علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی وفات کے بعد بھی ادارے کی مختلف سرگرمیوں سے ان کی دل چسپی برابر جاری رہی اور تاحیات انھوں نے ادارے کو بہ حیثیت سرپرست اعلیٰ اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

جہاں تک محترمہ تہنیت کی شعر گوئی کا تعلق ہے جیسا کہ اس سے پہلے بھی مذکور ہوا ہے۔ وہ اردو کی ایک خوش گو شاعرہ تھیں اور غزل کی ہیئت میں ان کی نعتیہ شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک پابندِ صوم و صلوات، نیک سیرت اور شریف النفس خاتون تھیں۔ خوش قسمتی سے انھیں دو بار زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہونے کا موقع ملا ہے۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے سرفراز ہونے کے بعد ہی انھوں نے باقاعدہ نعت گوئی کا آغاز کیا تھا:

نعت گوئی کے سوا شغل نہیں کوئی پسند
تہنیت شوق سے معروف اسی کام میں ہے

خدا کرے کہ پھر اک بار واں پہنچ جائیں
تمھارے فیض کا چشمہ جہاں ابلتا ہے

۱۹۶۶ء میں دوسری بار حج و زیارت مقاماتِ مقدسہ کی سعادت حاصل کرنے سے پہلے انھوں نے، صبا کے ذریعے، سرکارِ مدینہ کو بہ صد ادب یہ پیام بھیجا تھا:

کہنا صبا مدینے کو جاکر بہ صد ادب
گل دستہ ایک نعتیہ اب لا رہے ہیں ہم

لیکن بہ فضلِ الٰہی محبوبِ خدا کی شان میں انھوں نے ایک نہیں تین نعتیہ گل دستے آراستہ کرنے کا شرف پالیا تھا۔ زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے اور بہ قول ایم۔ اسلم "کلام کے ہر لفظ سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح مترشح ہو رہی ہے جیسے ساون کی مخمور گھٹاؤں سے موتی برستے ہیں" (۸)۔

نعت گوئی کے لوازمات میں حضور اکرمؐ سے والہانہ عشق کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ نعت گو شاعر حبِ رسولؐ میں جس قدر سرشار ہوگا اس کے کلام میں اتنی ہی جاذبیت، تاثیر اور دل کشی پیدا ہوگی۔ تہنیت النسا بیگم صاحبہ امجد حیدرآبادی کے الفاظ میں حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی ہیں (۹)۔ اس لیے ان کی نعتوں میں دل کشی اور دل آویزی بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ "یادِ نبیؐ" ان کے لیے "وجہ سکونِ دل و جگر بھی ہے اور "لذتِ مدام" بھی۔ اسی لیے ان کے لبوں پر بار بار سرکارِ دوعالم کا نام آجاتا ہے:

یادِ نبی ہے وجہ سکونِ دل و جگر
یہ لطف عارضی نہیں ہے لذت مدام

یہ بات یاد رہے تہنیت خدا کے لیے
کھلے جو منہ تو کھلے مدح مصطفیٰؐ کے لیے

ملتا ہے لطفِ خاص سدا ہر گھڑی ہمیں
آتا ہے بار بار لبوں پر جو انؐ کا نام

آپؐ کی یاد بار بار آئے
دلِ وارفتہ کو قرار آئے

یادِ نبیؐ، مدحِ مصطفیٰؐ اور ذکرِ سرورِ کائنات کی مناسبت سے ان کی نعتوں میں مدینہ منورہ، روضہ رسول اور گنبدِ خضرا سے عقیدت و احترام کا اظہار بھی بڑے والہانہ اور موثر انداز میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدینے ہی میں ملے گا سرورِ قلب و نظر
کہ جلتے رہتے ہیں واں رحمت و کرم کے چراغ

وہاں صبح و مسا اللہ کی رحمت برستی ہے
مدینہ نام جس بستی کا ہے دراصل جنت ہے

خدا کرے کہ نظر میں سدا رہے اپنی
وہ سبز گنبدِ اقدس کہ جو ہے جانِ حرم

رہے نظروں میں گنبدِ خضرا
ان کا جلوا ہو زندگی کے قریب

رہتا ہے شب و روز تصور میں ہمارے وہ گنبد خضرا کہ جو ہے جان مدینہ

مدینے سے دوری کا احساس اور اپنے غموں کے مداوا کے لیے حضورؐ سے فریاد، مدینہ بار بار جانے کی خواہش، روضہ رسول پر درود و سلام پڑھنے اور در نبیؐ پر جان دینے کی تمنا، محترمہ تہنیت کی نعتیہ شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔

سرکار دوعالم سے ہم دور بہت ہیں
مغموم ہیں، دل گیر ہیں، رنجور بہت ہیں
خدا کرے کہ پہنچ جائیں جلد طیبہ میں
تڑپ رہے ہیں دل و جاں اسی فضا کے لیے
مدینہ ہی کا تصور ہے تہنیت ہردم
نہیں ہے فکر کہ کب اپنا دم نکلتا ہے
زندگی چین سے گزرے گی مدینے ہی میں
موت اگر آئے تو مرنا بہت آساں ہوگا
اک تمنا رہ گئی ہے ان کے در پر جان دوں
کاش پوری ہوسکے اس خستہ تن کی آرزو
جو پہنچوں مدینہ تو واپس نہ لوٹوں
مری جاں ہو یارب نثار مدینہ

اسی خواہش، اسی تمنا اور اسی آرزو میں شدت جذبات سے کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر وہ اشکبار بھی ہو جاتی ہیں:

یاد انؐ کی دلا گئے آنسو بخت خفتہ جگا گئے آنسو
تہنیت پھر مدینہ یاد آیا اپنی آنکھوں میں آ گئے آنسو

فیض معمور فضاں سے لپٹ کر رولیں
پھر مدینے کی ہواؤں سے لپٹ کر رولیں
ابر چھایا ہے ہوائیں ہیں مدینے سے دور
جی تڑپتا ہے، گھٹاؤں سے لپٹ کر رولیں
یاد جو آرہی ہے تمہاری

بہتے جاتے ہیں اشکوں کے دھارے
دیکھیں گے کبھی تہنیت اپنی بھی طرف وہ
اشکوں سے جو ہم آنکھوں کو نم کرتے رہیں گے

روضۂ پاک کی جالیاں ہیں
اور ادھر اپنی آنکھیں ہیں پرنم

مدینے کی ہوا محترمہ تہنیت کے لیے باعثِ تسکین ہے، اسی لیے وہ بادِ صبا کے ساتھ اس ارضِ مقدس تک پہنچنے کی تمنا کرتی ہیں:

تہنیت باعثِ تسکیں جو ہوئی
یہ مدینے کی ہوا ہے شاید

صبا لے چل اڑا کر ساتھ اپنے تہنیت کو بھی
گزر ہونے کو ہو تیرا مدینے کی جو راہوں سے

ہاں بتا دینا ذرا بادِ صبا مجھ کو بھی
عزمِ طیبہ ہے اگر ساتھ ہی تیرے ہولوں

محترمہ تہنیت کی نعتوں میں جگہ جگہ فیضانِ رسولؐ اور حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کے نقوش منور نظر آتے ہیں۔ انھوں نے یہ نقوش بڑے اخلاص، عقیدت اور دردمندی کے ساتھ ابھارے ہیں:

یاد ہے اب بھی ساری دنیا کو ان کے فیضانِ عام کی باتیں

درِ فیضِ سرورِ انس و جاں، ہے جہاں میں مامنِ بیکساں
جو کوئی نصیب سے پہنچے واں، وہی اپنی بگڑی بنا گیے

رحمت اللعالمیں کے فیض سے نورِ لمعاں جلوہ گر ہونے لگا

سدا ان کا فیضان جاری رہے گا گزرتے رہیں گے یوں ہی سب زمانے

وہیؐ ہیں عارفِ کامل وہی بہ فیضِ کرم
بشر کو دہر میں دانائے راز کرتے ہیں

انؐ کی تعلیم سے وحشی بھی ہوئے شائستہ
یعنیؐ انسانیت آہی گئی انسانوں میں

اس گل سے یہاں سب کو ملا ہے فیضِ رنگ و بو
کوئی پھول اس طرح کا پھر نہ مہکے گا گلستاں میں

فیضانِ نبیِ کریمؐ اور آپؐ کی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو تہنیت صاحبہ نے سرور دو عالم کی سیرت و سوانح اور بنی نوعِ انسان پر آپؐ کے احسانات، آپؐ کی امانت، صداقت، دیانت، اخوت، محبت، بخشش، عنایت جود و سخا، فضل و عطا، علم و حلم جیسے اعلیٰ اوصاف اور اخلاقِ حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے:

عرب اور عجم میں رہے جس کے چرچے　　تجارت میں تھی وہ دیانت تمھاریؐ
رہی نقش بن کر عدو کے بھی دل میں　　شرافت تمھاریؐ صداقت تمھاریؐ
اٹھائیں خدمت انساں کی خاطر زحمتیں ایسی　　مثال ان کی نہیں ملتی کہیں تاریخ انساں میں

شہہ کونین جس کے پاس چاندی تھی نہ سونا تھا
وہ سردارِ دوعالم بوریا جس کا بچھونا تھا

جو ان کے درسِ صبر و شکر کو پیشِ نظر رکھے　　اسے کیا فکر جو اہل جہاں بیداد کرتے ہیں

سرسید احمد خاں نے جس طرح "مسدسِ حالی" کو اپنی بخشش کا ذریعہ قرار دیا تھا بالکل اسی طرح عبدالرحمن خاں چغتائی محترمہ تہنیت کے پہلے مجموعہ۔ نعت" ذکر و فکر" کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ذکر و فکر" روح کی بالیدگی کا وہ روحانی تحفہ ہے جس کو بغل میں دبائے جنت میں جانے سے کوئی روک نہیں سکتا" (۴)۔

حواشی:۔

(۱) آغا حیدر حسن۔ تسلیم و رضا۔ ص ۸۔
(۲) سید رفیع الدین قادری (شخصی انٹرویو)
(۳) خواجہ حمید الدین شاہد۔ سرگزشت ادارۂ ادبیاتِ اردو، بہ حوالہ۔ ڈاکٹر زور شخصیت اور کارنامے، مرتبہ عطیہ رحمانی۔ ص ۸۳۔
(۴) مقدس آغوشِ محبت و عظیم گہوارۂ تربیت" مشمولہ ماہ نامہ "نعت" لاہور اکتوبر ۔ ۹۷ء

ص ٨٦۔

(۵) سید رفیع الدین قادری (شخصی انٹرویو)

(٦) مقدس آغوشِ محبت...... ص ٩٠

(٧) یادگارِ زور۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد۔ ص ٩٢۔

(٨) صبر و شکر۔ ص ٩۔

(٩) ذکر و فکر۔ ص ٧۔

(١٠) صبر و شکر۔ ص ١٠٥۔

○ ○ ○

نظیر اکبرآبادی - شخص اور شاعر

ولی محمد نظیر، اردو کے ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ تاریخ ادب اردو میں انھیں بحیثیت نظم نگار ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ نظیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ وہ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ نظیر کے دادا عظیم آباد کے کسی نواب کے مصاحب تھے۔ نظیر کی والدہ نواب سلطان خاں قلعہ دار آگرہ کی دختر تھیں۔ محمد فاروق کو بارہ اولادیں ہوئیں لیکن ایک بھی زندہ نہ بچی۔ بڑی منتوں مرادوں اور دعاؤں کے بعد نظیر پیدا ہوئے۔ وہ گویا محمد فاروق کی تیرہویں اولاد تھے۔ بڑے لاڈ پیار سے پلے بڑھے۔ چوں کہ ان کے ماں باپ کی کئی اولادیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس لیے نظر بد سے بچانے کے لیے نظیر کی ناک اور کان چھید دیے گئے۔ چوٹی رکھی گئی اور ان کی شکل بچیوں جیسی بنادی گئی (۱)۔

نظیر کی ابتدائی زندگی پریشان حالی اور عسرت میں بسر ہوئی۔ وہ ابھی چار سال ہی کے تھے کہ دہلی جیسے عالم میں انتخاب شہر کو پے در پے مصیبتوں اور تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نظیر بائیس تیئس سال کی عمر میں اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ دہلی سے آگرہ کوچ کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ نوری دروازے کے قریب مکان لے کر رہنے لگے آخر عمر تک اسی مکان میں رہے اور یہیں سپرد خاک کیے گئے۔

شاعری کے علاوہ نظیر نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ نثر میں ان کی درج ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔

"انشائے نظیر" "قدرِ متین" "فہمِ قرین" "بزم عیش" "رعنائے زیبا" "بازارِ حسن" "طرز تقریر"

شاعری میں ضخیم کلیات کے علاوہ انھوں نے مثنوی "حسن و عشق" اور ایک

کتاب "خالق باری" کے انداز میں بھی لکھی تھی۔ نظیر پیشے کے اعتبار سے معلم تھے اور تمام عمر اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ روایتوں کے مطابق وہ شرفاے اکبر آباد کے بچوں کے اتالیق تھے۔ اگرچہ کہ وہ ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھے۔ لیکن کبھی بھی انھوں نے شاعری کو تجارت نہیں بنایا۔ قناعت اور استغنا طبیعت میں داخل تھا۔ اس لیے کسی بادشاہ، راجہ یا نواب کی مصاحبت قبول نہیں کی۔ نواب واجد علی شاہ نے ان سے لکھنو آنے کی درخواست کی اور رقم بھی بھجوائی لیکن انھوں نے آگرے کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور رقم واپس کردی (۲)۔ اسی طرح بھرت پور کے راجہ اور حیدرآباد کے نظام نے بھی انھیں طلب کیا تھا لیکن وہ نہیں گئے (۳)۔

نظیر سیر سپاٹے کے بڑے رسیا تھے۔ مختلف تہواروں، عیدوں، جاتراوں، عرسوں، میلوں، ٹھیلوں کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ ان کے ضخیم کلیات میں مذکورہ موضوعات کے تحت متعدد نظمیں موجود ہیں۔ سخن سنجی اور سخن فہمی کا ملکہ انھیں قدرت سے ملا تھا۔ کم عمری سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے باقاعدہ کسی استاد کے آگے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا بلکہ متعدد نو مشق شعرا ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ نظیر کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ ان کے چند اہم تلامذہ میں قطب الدین باطنؔ، راجہ بلونت سنگھ، راجہ بدھ سنگھ صافیؔ، شیخ مداری ضمیرؔ، حکیم محمد مہدی ظاہرؔ، شیخ نبی بخش عاشقؔ، منشی حسین علی خاں ماہؔ، بیدار بخش لہرؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

نظیر نے شاعری میں ایک منفرد راہ نکالی جو اس دور کی شاعری کی عام روایت سے قطعی مختلف تھی۔ انھوں نے خود کو اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور نئے نئے موضوعات عطا کیے۔ نظیر نے خود کو اردو شاعری کے مروجہ دھارے سے جدا رکھا۔ انھیں مشاعروں میں شرکت کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھے۔ ہندوستان میں بسنے والے عوام کی زندگی کا انھوں نے بہت

قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات زندگی کو انھوں نے عوام کی زبان میں نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ نظیر کے کلام میں عام ہندوستانی مناظر قدرت، ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی طور طریقوں کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے کلیات میں ہولی، دیوالی، پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ بسنت اور کرشن جینتی پر بھی، ان کی بعض نظمیں بظاہر بہت معمولی موضوعات پر لکھی ہوئی ہیں مثلاً "روٹی، پیسہ، بخل، مفلسی، خوشامد" وغیرہ لیکن نظیر نے ان نظموں میں سیدھے سادے انداز میں بڑی حکیمانہ اور فلسفیانہ باتیں بیان کی ہیں۔ غزل اور مثنوی جیسی مروجہ اصناف سخن سے ہٹ کر انھوں نے نظم کی مختلف ہئیتوں کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے اردو نظم کو ایک ایسے دور میں ذریعہ اظہار بنایا جب کہ تمام اصناف سخن پر غزل کی حکمرانی تھی۔ نظیر نے اگرچہ متعدد غزلیں کہی ہیں اور ایک اچھے غزل گو بھی تھے لیکن حالی اور آزاد سے بہت پہلے تنِ تنہا انھوں نے اردو نظم کی روایت کا آغاز کیا تھا۔ نظیر کے کلام میں زندگی کی رنگارنگی اور حرارت، شاعری کے روپ میں سمائی ہوئی ملتی ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں نظیر اپنے وجود سے خود ایک دبستان اور ایک عہد تھے جو انھیں سے شروع ہوکر انھیں پر ختم ہوتا ہے۔

اردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی سے ہوتا ہے۔ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا شمار، اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے پہلی مرتبہ انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام لاہور میں نئی طرز کے مشاعرے منعقد کئے۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں طرحی مصرع دیا جاتا تھا، جس پر سبھی شاعروں کو اسی زمین اور قافیہ و ردیف کی پابندی کرتے ہوئے غزلیں کہنی ہوتی تھیں، اس کے برخلاف انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جاتا تھا۔ جس پر تمام شاعروں کو نظمیں لکھنی ہوتی تھیں۔ آزاد اور حالی کے بعد اسمٰعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں

آبادی، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور دوسرے شعرا نے اردو نظم کو وسعت بخشی۔ نظیر کو ان کی زندگی میں خاطر خواہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی موت کے کافی عرصہ بعد جب اردو کے انگریز عالموں نے نظیر کے کلام کا مطالعہ کیا اور انھیں "اردو شاعری کا شیکسپیئر" قرار دیا تو اردو کے نقادوں نے نظیر پر توجہ کی۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید لکھتے ہیں:

"نظیر اکبر آبادی کا اردو ادب کے مورخین اور ناقدین نے ایک عرصے تک حق ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ان کا دور نظیر کا دور نہیں تھا۔ سچ پوچھیے تو خود نظیر کا دور بھی نظیر کا دور نہیں تھا۔ وہ تو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوچکے تھے اور اپنے کلام سے ایک ایسے دور کی بشارت دی تھی، جو واقعی عوامی ادب کا دور تھا، حقیقت نگاری، واقعیت پسندی کا دور ایک ایسا دور جس میں ایسے، موضوعات، الفاظ اور اسالیب سے شاعری میں کام لیا گیا جن کو غیر شاعرانہ خیال کرتے ہوئے اس وقت کے فن کاروں نے خاطر میں نہیں لایا"(۴)۔

نظیر کا کلام احساسات اور تجربات کا آئینہ ہے وہ ایک وسیع المشرب انسان تھے اور تمام مذاہب اور فرقوں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں ہندو مسلم، سکھ عیسائی تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ انسانی بھائی چارگی، آپسی میل جول، اخوت اور محبت کے علم بردار تھے۔ اس لیے اپنے کلام میں رواداری، بے تعصبی اور مساوات کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں

زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں
عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحبِ اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا بس اک نام رہے گا

ہندوستانی تہذیب کی روح ان کی شاعری میں رچ بس گئی ہے۔ وہ ہندوستانی مناظر قدرت، ہندوستانی معاشرت اور ہندوستانی رسوم و رواج کی اپنی شاعری میں بے کم و کاست ترجمانی کرتے ہیں۔ بقول پروفیسر مجنوں گورکھپوری:

"نظیر خالص ہندستانی شاعر تھے۔ ہندوستان کی زندگی، ہندوستان کے رسوم و روایات، ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں اور ان ہی سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ نظیر اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کلام پڑھ کر ہندوستان کے حالات کی عام معاشرت اور یہاں کے رسم و رواج کے متعلق معلومات حاصل کیے جاسکتے ہیں (۵)۔

نظیر نے نہ صرف اسلامی عیدوں اور مذہبی رہنماؤں سے متعلق نظمیں لکھی ہیں بلکہ غیر مسلم مذہبی شخصیتوں اور عیدوں، تہواروں اور میلوں، ٹھیلوں کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ انھیں ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے ہندو فلسفہ، ہندو دیو مالا اور ہندو معاشرت و رسم و رواج سے غیر معمولی شغف تھا۔ جس موضوع پر بھی انھوں نے اپنے طائر فکر کو پرواز دی گویا سخن کے دریا بہادیئے۔ کرشن جینتی اور ہولی کی بہار کے زیر عنوان لکھی ہوئی نظموں کا ایک ایک بند ملاحظہ کیجیئے۔

تعریف کروں میں اب کیا کیا اس مرلی دھر بجیا کی
نت سیوا کنج بھریا اور بن بن گئو چریا کی

گوپال، بہاری بنواری دکھ ہرنا مہر کریّا کی
گردھاری، سندر، شیام برن اور بلدھر جو کے بھیّا کی
یہ لیلا ہے اس نند للن موہن جسمت چھیّا کی
رکھ دھیان سنو ڈنڈوت کرو جے بولو کشن کنھیّا کی

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر واقعات اور حقائق کے شاعر ہیں۔ حقیقت پسندی ان کے کلام کا ایک اہم وصف ہے۔ وہ تخیل پرستی اور خیال آرائی کے قائل نہیں۔ وہ اپنے اطراف و اکناف کی زندگی۔ اور حقائقِ حیات کو سادگی، برجستگی، روانی اور بے تکلفی کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت ان کی زبان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئیے۔ ان کی زبان آگرے کی بول چال کی زبان سے مشابہہ ہے۔ اس میں کہیں برج بھاشا اور کھڑی بولی کا امتزاج بھی نظر آتا ہے۔ بعض نظموں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ پنجابی اور اودھی سے بھی واقف تھے۔ نظیر کی زبان کے مطالعہ سے ان کی شخصیت کی مختلف تہیں بھی سامنے آتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی زبان اس عہد کے دوسرے اردو شاعروں کی زبان سے مختلف ہے۔ وہ اپنے اشعار میں وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو اس زمانے میں عملاً بولی جاتی تھی۔ وہ ایسے الفاظ کو بھی اپنی نظموں میں استعمال کرتے تھے جن کا تلفظ کرخت یا بھونڈا معلوم ہو۔ یہی سبب

ہے کہ نظیر کے کلیات میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو نہ کلیات میر میں نظر آتے ہیں اور نہ کلیات سودا میں اور نہ ہی میر حسن یا درد کے اشعار میں ۔ متعدد الفاظ ان کے ہاں ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اردو کی مروجہ ڈکشنریوں میں بھی بار نہیں پاسکے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی زبان ان کی شاعری کی طرح عوامی زبان ہے ۔ ذیل میں نظیر کی نظموں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ اک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر
جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی نماز اور قران یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

شبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نارد من ہیں دھیان بھلے سب اس کا بھید بتاتے ہیں

وہ نیک مہورت ہے جس دم اس سرشٹ میں جنمے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ دکھلا جاتے ہیں
یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں ان کے اُپکار نرالے ہوتے ہیں

اس ارض و سما کے عرصے میں یہ جتنا کھّیم کھچّا ہے
یہ ٹھاٹھ تجھی نے باندھا ہے یہ رنگ تجھی نے رچّا ہے
حیوان پکھیرو، نر ، ناری ، کیا بوڑھا بالک بچّا ہے
کیا دانا ، بینا ، ہوش بھرا ، کیا بھولا ، ناداں کچّا ہے
کل عالم تیری یاد کرے تو صاحب سب کا سچّا ہے

واقعہ یہ ہے کہ نظیر ایک عظیم المرتبت اور قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ بصیرت مفکر بھی تھے۔ نظیر اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ اقبال ایک صاحبِ بصیرت مفکر بھی تھے اور اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ عالم بھی۔ علمی نقطۂ نظر سے نظیر اکبر آبادی ایک اوسط درجے کے تعلیم یافتہ آدمی تھے لیکن وہ اس حکیمانہ بصیرت کے حامل تھے جو ایک مفکر کا سرمایہ ہوتی ہے اور اسی حکیمانہ بصیرت نے نظیر کو ایک بلند پایہ شاعر کا مرتبہ عطا کیا۔

حواشی

(۱) زندگانی بے نظیر۔ پروفیسر شہباز۔ ص ۱۴۔

(۲) سید احتشام حسین۔ اردو کی کہانی۔ ص ۴۶۔

(۳) نظیر اکبر آبادی۔ ص ۱۷۔

(۴) نظیر شناسی۔ ص ۱۰۔

(۵) مجنوں گھورکھپوری۔ مضمون مشمولہ نظیر شناسی۔ ص ۹۷۔

داستانوں میں تہذیبی عناصر

داستانوں کی اہمیت صرف اس وجہ سے نہیں کہ یہ اردو نثر کی قدیم اصناف میں شمار ہوتی ہیں بلکہ لسانی اور تاریخی اہمیت کے پہلو بہ پہلو ادبی نقطہ نظر سے بھی ان میں بزرگی اور عظمت کے آثار ملتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم داستانوں کو زندہ ادب میں شمار کرتے ہیں۔ ان میں ہماری سماجی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں محفوظ ہو گئی ہیں، اس میں شک نہیں کہ بیشتر داستانیں فنی لوازم اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں دل اچاٹ کر دینے والی یک رنگی اور یکسانیت ہوتی ہے بلکہ زبان و بیان، موضوع و مواد اور مقصد اور مطمحِ نظر کے فرق نے ان میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کر دی ہے۔ بعض داستانیں قصہ در قصہ کا لطف دیتی ہیں۔ بعض طویل اکہرے قصے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض میں تاریخی حقائق کی ترجمانی نظر آتی ہے اور بعض میں مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی کی وجہ سے تحیر آمیز فضا ملتی ہے اور بعض میں زندگی کی عام سماجی اور تہذیبی روایات کا عکس نظر آتا ہے۔ بعض عشق و محبت کے واردات اور جذبات کی ترجمان ہیں، بعض جنگ و جدل کے واقعات کی عکاس۔ بعض زندگی کے کسی خاص پہلو کی نمائندگی کرتی ہیں اور بعض اپنے عہد و ماحول کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ بعض طبع زاد ہیں۔ بعض کا تانا ہندستان کے مقبول قصوں سے ماخوذ ہے۔ بعض پر عرب اور ایران کی داستانوں کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور بعض پر خالص ہندستان اور مقامی عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ داستانوں کی فضاء میں یک رنگی نہیں رنگا رنگی ہے۔

اردو کی بیشتر داستانیں سلاطین، امراء اور رئیسوں کو خوش کر کے، ان سے انعام و اکرام حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ادبی نکات اور فنی محاسن کے بشمول یہ داستانیں ادب اور تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب بن گئی ہیں۔ ان کے

مطالعہ سے ایک طرف صدیوں پہلے کی زبان کی لسانی خصوصیات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے اور عہد بہ عہد اردو نثر میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل اور اس کی املائی خصوصیات کے علاوہ ارتقا کی منزلوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اردو کے داستانوی ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف لوگوں کے عقائد و توہمات، رسوم و رواج، طور طریقے اور طرز زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ہندستانی ماحول، مناظر قدرت اور باغوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ مقامی عشاق اور بہادروں کے حوالے بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ داستان گو اکثر و بیشتر درباروشاہی کے ملازم اور رئیسوں کے دست نگر ہوتے تھے۔ ان کا مقصد اپنے محسنوں کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے زیادہ تر داستانوں میں شاہی دربار سے وابستہ افراد یا اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اردو میں ایسی داستانوں کی بھی کمی نہیں جن میں دیہاتی ماحول اور نچلے طبقے کے افراد کی زندگی کے نقوش پائے جاتے ہیں۔

ہر دور میں بعض مخصوص حالات کے تناظر میں کسی خاص پہلو پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ داستانوں میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ ایک طرف اس عہد کے تہذیبی رجحانات اور ایک مخصوص ثقافتی ماحول میں رہنے بسنے والوں کی متحرک تصویریں سامنے آتی ہیں تو دوسری طرف ان کے رسوم و رواج، عقائد، نظریات، اخلاقی معیارات ٹوٹکے، شگون، گفتگو کے طور طریق، حرکات و سکنات اور زندگی کی بعض ابدی حقیقتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ہماری داستانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہندالمانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتی ہے اور معدودے چند داستانیں ایسی بھی ہیں جن میں خالص ہندو تہذیب و ثقافت کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس قبیل کی داستانوں میں "مادھونل و کام

کندلا"، "بیتال پچیسی"، "سنگھاسن بتیسی"، "رانی کیتکی کی کہانی" اور" باغ ارم" کے نام نمایاں ہیں۔ اول الذکر تین داستانوں میں قدیم ہندوستان کے ویدک کال دور کی تہذیب کا شعور ملتا ہے۔ مثال کے طور پر راجا بکرماجیت کے عہد میں امن وامان اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ اس وقت مصوری موسیقی اور جوتش کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ جوگ اور تپسیہ کی اتنی اہمیت تھی کہ بعض وقت راجا راج پاٹ چھوڑ کر جوگی اور سنیاسی بن جاتے تھے۔ برہمنوں اور سادھوؤں کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی تھی۔ "رانی کیتکی کی کہانی" اور" باغ ارم" میں جو ہندو تہذیب و ثقافت پیش کی گئی ہے وہ اول الذکر داستانوں کی طرح قدیم تہذیب نہیں ہے۔ ان میں مذہبی عقائد، مافوق فطرت واقعات کو چھوڑ کر باقی تمام باتیں ایسی ہیں جو بعد کے زمانے میں بھی ملتی ہیں۔ داستانوں میں پائے جانے والے تہذیبی عناصر کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں داستان نویسوں نے مختلف اشیاء کے ناموں کی طویل طویل فہرستیں بھی دے دی ہیں۔ ان فہرستوں میں اہل معاشرہ مختلف علوم وفنون، پھول پھل، جانور، بازار، لباس، جواہرات، اشیائے خوردنی، ساز، راگ، آتش بازی وغیرہ کے تفصیلی مرقعے پیش کیے گئے ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ذیل میں مختلف داستانوں سے چند افراد و اشیاء کے نام نموتاً پیش کیے جارہے ہیں۔

افراد معاشرہ۔ وزیر، امرائے صاحب تدبیر، حکیم حاذق، منجم صادق، ملا سیانے خوب، درویش، سالک، مجذوب، دربان، روئے میوڑے، بازی دار، چوبدار، چور چکار، جیب کترے صبح خیزے، اٹھائی گرے، دغاباز، یتیم اسیر، عیال دار، محتاج، رانڈ، بیوہ، نوکر چاکر، خدمت گار، بھلئے، ڈھلیت، خاص بردار، (باغ و بہار ص ۶-۱۷)

ساز:

رباب، سرستار، تنبورہ، چنگ ۔ سرچنگ، سارنگی، تال، کھٹ تال، پکھاوج، منڈول، ڈولکی، بدہ خنجری" (داستان امیر حمزہ ص ۲۱)

چنگ، نالے، ڈھول، طبلے، کھماچ، طنبورہ، قانون، عود، دف، دائرہ چنگ، رباب" (سب رس ص ۶۳)

مردنگ، بین، جل ترنگ، بہ چنگ، گھنگرو کٹ تال (رانی کیتکی کی کہانی ص ۳۸)

راگ:

پٹا، خیال، دھرپت، گیت، سنگیت، تک، جنگل بند، ترانہ، سرگم، دستک فارسی، ٹھمری، کھروا (داستان امیر حمزہ ص ۲۱)

بھیروں، بھباس، الیاللت، رام کلی (فسانہ عجائب ص ۴۱)

علوم و فنون:

ہئیت، ہندسہ، بیان، ادب، منطق، معانی، معقول، رمل، نجوم، صرف، نحو، حدیث، تفسیر، فلسفہ (داستان امیر حمزہ ۔ ص ۲۱)

ریاضی الہیات، طبیعات، جغرافیہ، شعر و شاعری، انشاپردازی ۔ (فسانہ دل فریب ص ۳۲)

نستعلیق، نسخ، ثلث، ریحان، خفی، جلی، شکستہ، شگفتہ، گلزار (داستان امیر حمزہ ۲۱۵)

پھول:

"لالہ، نافرمان، جعفری، بابونہ، گیندا، جوئی، سوسن، چنبیلی، موتیا، موگرا، رائے بیلی، گلاب، سیوتی، کلفا، گل مہندی، گل خوشبو، داودی، چمپا، مولسری، ماگر بیل، عباس، نرگس، گل شیوا، بیلا، مدن بان (داستان امیر حمزہ ص ۷)

پھل اور میوے:

سیب، ناسپاتی، نمرت، قندی، بادام، چھوہارا، پستہ، کشمکش، انگور، انجیر (امیر حمزہ۔ ص ۲۰۳)

انار، بہی، پستہ، بادام، اخروٹ، انگور (سروش سخن۔ ص ۱۱۲)

کشمش، چلغوزے، انار، بادام، سیب، جامن، آم، رنگ ترے، انگور، کیلے، بیدانہ، امرود، شریفہ، میٹھا، چکوترا، فالسہ، چکیا (شگوفہ محبت۔ ص ۷۶)

پرندے اور چرندے:

طوطے، بلبل، فاختہ، مور، عندلیب (داستان امیر حمزہ۔ ص ۷)، قاز، قرقرے، کبوتر، ہریل، مرغابیاں، طاؤس، تیتر، لوے، بٹیر، (فسانہ دل فریب۔ ص ۹۲)

فاختہ، قمری، بلبل، مور کبک، تدرو قاز، قرقرے (فسانہ عجائب ص ۲۵)

باز، شاہین، شکرا، بہری، سیاہ گوش، چیتے، تازی، باہڑے، صید افگن باز، بحری، باشے، عقاب، ولایتی کتے، بودار، گلڈانک، تازی (گل و صنوبر۔ ص ۵)

بازار:

مینار بازار، خاص بازار، جوہری بازار، نخاس بازار (سروش سخن۔ ص ۱۱۲)

جواہرات:

مروارید، لعل، یاقوت، مرجان، الماس، ڈاک، ہیرا، کندن، نیلم، زمرد، ڈھلک (سروش سخن ص ۱۱۲)

اشیائے خوردنی:

نان ترین، نان ورقی، نان نعمت، نان گلزار، نان روغنی، نان اعلیٰ،

نان آبی، نان خطائی، نان چپاتی، نان پھلکہ، نان باقرخانی، گاؤزبان،
پلاؤ بیگمی، پلاؤ لاپود، پلاؤ کوکو، پلاؤ موتی، پلاؤ زعفران، پلاؤ متنجن
(داستان امیر حمزہ ص ۲۰۳)

پوری، کچوری، مٹھائی، اچار، پلاؤ، قلیہ، زردہ (فسانہ عجائب، ص ۳۹

کوفتہ، تکہ، مرغ، خاگینہ، ملغوبہ، شبدیگ، حلیم، ہریسیا، سموسے،
ورقی، حلوہ، نامودہ، مربہ، اچار، دہی (باغ و بہار۔ ص ۶۲)

مندرجہ بالا فہرستوں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ داستانوں میں تہذیبی و ثقافتی عناصر صرف انھیں فہرستوں سے عبارت ہیں۔ دراصل داستانوں میں تہذیب و معاشرت کی عکاسی کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ ورنہ داستانوی ادب میں سماجی، معاشرتی اور ثقافتی اجزاء کی روح ازاول تا آخر جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اردو داستانوں میں بچے کی ولادت سے پہلے سے لیکر موت تک مختلف رسومات اور تقریبات کے تفصیلی مرقعے محفوظ ہوگئے ہیں۔ داستان گو حضرات نے ان رسومات کی پیشکش میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آنے والی اولاد کی خوشی میں ستوانے، اٹھوانے یا نوماسے کی رسمیں ہوتی ہیں، اس تقریب میں سارے کنبے کے افراد جمع ہوکر حاملہ کو پھول پہناتے ہیں اور اس کی گود بھرتے ہیں۔ چناں چہ "فسانہ دل فریب" میں گیتی آراء کے دوران حمل نوماسے کی رسم منائی گئی تھی جس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے:

"محل میں سب دعائیں مانگ رہی ہیں۔ آسمانی وضع حمل کے گنڈے تعویذ جابجا سے آتے جاتے ہیں۔ جو لوگ اس دن کے امیدوار تھے وہ اپنی رسوخیت جتاتے ہیں۔ کہیں سے پھونکا ہوا پانی آتا ہے۔ کوئی پڑھا ہوا گز لاتا ہے۔ گیتی آراء کی ماں ہر طرف بے حواس پھرتی ہے" (ص ۳۰۔)

بچے کی پیدائش کے بعد تو گویا مختلف تقریبات اور رسومات کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ سرشار کی "الف لیلی" سے ایک اقتباس دیکھئے۔

"خدا خدا کر کے اس سوداگر کے گھر ایک فرزند دل بند پیدا ہوا، جس کے حسن و جمال پر ایک عالم شیدا ہوا۔ پیدا ہوتے ہی دایا نے محمد اور علی کا نام سنایا اور شر آفات سے بچایا اور کان میں تکبیر و اذان سنائی اور ماں کے پاس لائی۔ (ص ۵۳۵)

"باغ و بہار" میں شہزادہ بختیار کے تولد ہونے پر بادشاہ آزاد بخت کی داد و دہش مغل فرماں رواں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ "شگوفہ محبت" میں آذر شاہ کو جب خدا نے اولاد کی دولت سے مالا مال کیا تو اس کی خیر خیرات، بخشش و انعام کا حال پڑھنے سے ہندستانی بادشاہوں کی داد و دہش کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ بچے کی ولادت پر زائچہ بنوانے کی رسم ہندالمانی تہذیب کی علامت ہے جو کم و بیش ہر داستان میں نظر آتی ہے۔ بچے کی پیدائش پر اس کی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لئے زائچہ بنوایا جاتا تھا۔ اور نومولود کی آنے والی زندگی کے بارے میں نجومیوں سے معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔ باغ و بہار میں شہزادہ نیم روز کی پیدائش پر نجموں کا بیان "فسانہ عجائب" کے جہان عالم کی ولادت پر ماہر علم نجوم کی پیشن گوئیاں اور فیروز بخت کے غریبوں اور محتاجوں میں خیرات اور بخشش کے تقسیم کرنے کا حال قابل مطالعہ ہے۔

بچہ کی پیدائش کے بعد چلہ، چھٹی، ختنہ اور بسم اللہ کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ "شگوفہ محبت" میں فرزند آذر شاہ سے متعلق مختلف رسومات اور تقریبات کا بیان سرور کی زبانی ملاحظہ کیجئے۔

"چالیس دن تک یہ کیفیت رہی۔ چھٹی چلے کی رسم ہو گئی۔ وہ گوہر گراں مایہ آغوش دایہ میں پرورش پاتا تھا۔ ہر روز نمو کی بہار دکھاتا تھا۔ موافق معمول، دودھ بڑھا، کھیر، چٹائی، کھانے پینے کی نوبت

آئی۔ جو دن گزرا وہ مہینہ تھا۔ ہر ماہ سال ہوا۔ نو، دس برس میں بدر کا کامل وہ ہلال ہوا۔ بسم اللہ ہوئی معلم ادیب خوش نویس پڑھانے لکھانے گئے۔ سن تمیز میں گھوڑے پر چڑھنا۔ تیر اندازی، لکڑ پھینکی، برچھا چلانا سکھانے لگے"

سرشار نے "الف لیلہ" میں ختنہ کی رسم کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

تقریب ختنہ کے دن بڑی دھوم دھام اور سامان تزک و احتشام سے دعوت دی گئی

(الف لیلہ۔ ص ۵۳۵)

پیدائش کے بعد رسوم و تقاریب کے سلسلہ میں دوسرا اہم موقع شادی کا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے داستان نگاروں نے مہندی، ساچق، مانجھے وغیرہ کی رسموں کے نقشے صفحہ قرطاس پر اتار دیے ہیں اور اپنی انشا اور معلومات کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

" سالیوں نے دولہا کے ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ اس نے شرما کے گردن جھکالی، اب اس سے فراغت پالی، نیگ مانگنے کی نوبت آئی، پہلے تو سالیاں لڑیں جھگڑائیں، بکھیڑا کیا آخر خدا دوست نے دولہا کی طرف سے سب کو مزا خور حال نیگ دیا" (فسانہ دل فریب)

" پکھراج کی کشتیوں میں زعفرانی جوڑے، سنہرے خوانوں میں ہنڈیاں مقوی مفرح ذائقہ ٹپکتا، خوان تک بسا اور دودھ پینے کے واسطے اشرفیوں کے گیا توڑے، طلائی چوکی پر جواہر جڑا، زمرد نگار، کٹورا بٹنا ملنے کا، کنگنا بہ از عقد ثریا، دریکتا، بڑا بڑا اتکا، لنگی ملتان کی تھی، بیل بوٹے میں رشک گلستان کی تھی، بٹنا اور تیل بے میل جو عطر کشمیر پر خندہ زن ہو معطر دماغ انجمن ہو، کنٹروں میں عطر سہاگ مہک، پری ایجاد نصیر الدین حیدری اور کچھ محمد شاہی فتنے کی بو، چار سو، زعفران کا تختہ کھلا، کوسوں تک خوان سے خوان ملا، نوبت

نشان گھوڑوں پر، شہنا نواز، نقارچی جوان جوان، سکھپال اور چنڈولوں میں زنانی سواریاں ان کے بناؤ کی تیاریاں کہاریاں پری چہرہ برق درخشاں کا عالم" (فسانہ عجائب۔ ص۔ ۳۹)

دولہا کو محل میں بلوایا۔ قمر النساء نے آنچل ڈالا۔ لوگوں نے اور بہت سے ٹوٹکے کئے۔ مسند پر بٹھایا۔ دولہن کو گود میں لائے۔ دولہا کے برابر بٹھایا۔ رست رسم ہونے لگی۔ پرستش صنم ہونے لگی۔ پہلے ایک خواص آئی۔ دولہن کا پائجامہ لائی اور کہنے لگی لو میاں! اس میں ایک ہاتھ سے ازار بند ڈالو۔ ادھر ادھر نہ دیکھو بھالو" (سروش سخن)

ولادت اور شادی کی طرح ہماری داستانوں میں موت سے وابستہ بھی چند رسوم نظر آتی ہیں۔ مرنے کے تیسرے دن کی رسم بیشتر داستانوں میں ہوتی ہے۔ چالیس دن تک مرنے والے کا سوگ منایا جاتا ہے۔ باغ و بہار میں جب یمن کے سوداگر کے والد کا انتقال ہوا تو اس نے چالیس دن تک اپنے باپ کا سوگ منایا "چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی"۔ (باغ و بہار۔ ص ۱۶)

اس طرح فسانہ دل فریب میں بادشاہ ایران کی موت پر اس کے بیٹے کے سوگ کا حال دیکھیے۔ "چالیس دن بدر سیاہ پوش رہا۔ باپ کے رنج و غم میں بے ہوش رہا۔ بعد ادائے رسوم چہلم عزیز و اقارب کے سمجھانے بجھانے لوگوں کے کہنے سننے سے تخت سلطنت پر بیٹھا۔۔۔۔ پھر ملک صالح اپنے بہنوئی کے مرنے کی خبر سن کر ماتم پرسی کے واسطے وطن سے تشریف لایا۔ بعد ادائے مراسم فاتحہ خوانی اپنی بہن کو امر بصیر کر کے بدر کو چھاتی سے لگایا" (فسانہ دل فریب۔ ص۔ ۵۹)

مختصر یہ کہ ولادت، شادی بیاہ، موت، سوم اور چہلم کی یہ تمام رسومات جو ہماری داستانوں میں بیان ہوئی ہیں اور ہندوستانی معاشرت کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن داستانوں میں صرف انھیں تین مواقع یعنی ولادت پیدائش اور موت سے متعلق

رسموں کا اظہار ہی نہیں بلکہ ان مخصوص موقعوں کے علاوہ بھی ہمیں ہماری روزانہ زندگی کے متنوع اور رنگا رنگ نقوش نظر آتے ہیں۔ ان میں ہمارے باغ بغیچے، میلے ٹھیلے، تیج تیوہار، بازار ہاٹ جلسے جلوس، کھانوں کپڑوں، برتنوں، زیوروں، سواریوں علوم و فنون، منتوں مرادوں اور عقیدوں کی بھرپور اور رنگ برنگی تصویریں سجی ہوئی ہیں۔

داستانوں نے ہم تک ہمارے تمدن اور تہذیب کی میراث پہنچانے کی گراں بہا خدمت انجام دی ہے۔ انھیں کے ذریعہ ہم نے اپنے بزرگوں کے فکر و خیال تک رسائی حاصل کی ہے۔ ان کی بود و باش کے طریقے، مشاغل و معمولات، عقائد و توہمات، رسم و رواج میلانات و رجحانات اور اخلاق و آدب غرض داستانوں میں قدیم معاشرت کی بھرپور اور مکمل عکاسی ملتی ہے۔ اگر ہمیں ہندوستان کی قدیم تہذیب و معاشرت کے بارے میں جاننا ہو تو داستانوں سے بہتر کوئی اور صنف ادب ہماری رہنمائی نہیں کر سکتی۔

○ ○ ○

رام پور کی داستانیں

اردو نثر کے ارتقاء میں داستانی ادب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسی صنف ادب میں، اردو نثر کے تدریجی ارتقاء اور عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کی مفصل تاریخ محفوظ ہو گئی ہے۔ شمالی ہند میں داستان نگاری کے تین مراکز کلکتہ، لکھنو اور رام پور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مذکورہ مقامات کے علاوہ کہیں اور داستانیں نہیں لکھی گئیں۔ داستانیں دلی، آگرہ اور دیگر مقامات میں بھی سپرد قلم کی گئیں، جس کی وجہ سے داستانوں کے ذخیرے میں اچھا خاصا اضافہ ہوا لیکن یہ کوششیں انفرادی ہیں اجتماعی نہیں۔

داستان نگاری کے اولین نمونے دکن میں ملتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں اس صنف ادب کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے، جزائر برطانیہ سے ملازمت کی غرض سے ہندوستان آنے والے انگیزوں کو اردو کی تدریس کے سلسلے میں ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں ایک کالج قائم کیا، جو آگے چل کر فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس زمانے میں انگریزوں اور دوسرے یورپی باشندوں کو اردو زبان سکھانے کے نقطہ نظر سے اردو میں کوئی موزوں کتاب نہیں تھی۔ اس خصوص میں کالج کے ارباب مجاز نے آسان اور عام فہم اردو میں قصے اور داستانیں لکھوانے کی باضابطہ تحریک چلائی، چوں کہ اردو میں طبع زاد داستانیں مفقود تھیں اور از سر نو طبع زاد داستانیں لکھوانے کے بجائے ترجمہ کروانے کا کام آسان تھا۔ اس لیے فارسی اور سنسکرت کی داستانوں کو اردو میں ترجمہ کروانے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس کالج کے زیر اثر جو داستانیں سپرد قلم کی گئیں ان میں بول چال کی عام فہم زبان کے استعمال پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دوران، کالج ہی میں کثیر تعداد میں داستانیں لکھوائی گئیں۔ کالج کے باہر لکھی جانے والی داستانوں کی تعداد صرف پانچ ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ کالج کے باہر کے مصنفین کی پشت پر نہ کوئی پرزور تحریک تھی اور نہ انھیں کسی کی سرپرستی حاصل تھی

فورٹ ولیم کالج میں جو داستانیں لکھی گئیں، ان میں باغ و بہار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور کالج کے باہر کی داستانوں میں انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج کے خاتمے کے بعد داستان نگاری کا مرکز کلکتے سے لکھنو منتقل ہو گیا۔ لکھنو میں تصنیف کی گئی داستانوں میں رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہء عجائب'' ایک اہم اور نمائندہ داستان ہے جو میر امن کی ''باغ و بہار'' کے جواب میں لکھی گئی۔ میر امن دلی کے رہنے والے تھے انہوں نے باغ و بہار میں دلی کی ٹکسالی زبان اور اپنے دہلوی ہونے پر فخر کیا تھا، جسے اہل لکھنو نے اپنی زبان دانی پر حملہ تصور کیا اور اس کے جواب میں رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' لکھ ڈالی۔ اس طرح لکھنو میں داستان نگاری کا رجحان فروغ پانے لگا۔ ۱۸۵۷ء میں جب لکھنو میں نول کشور پریس کا قیام عمل میں آیا تو داستان نگاری کی تحریک کو مزید تقویت پہنچی۔ نول کشور پریس کو اتفاق سے محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر جیسے باکمال داستان نگاروں کی خدمات حاصل تھیں جنہوں نے داستان امیر حمزہ کے ترجمے کو تصنیف کا درجہ عطا کر دیا۔

لکھنو کے اجڑنے کے بعد یہاں کے اہل کمال ایک ایک کر کے دربار رام پور منتقل ہونے لگے۔ جس طرح دہلی کے اجڑنے کے بعد وہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے دربار لکھنو میں اپنی پناہ ڈھونڈلی تھی، اسی طرح سلطنت لکھنو کے زوال کے بعد اہل علم و فضل جوق در جوق مصطفیٰ آباد عرف رام پور کی طرف کھنچے چلے آئے۔ بقول ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری:

''اردو شاعری کے دو اہم دبستانوں کے اجڑنے کے بعد رام پور ہی ایسی ریاست تھی جہاں دونوں دبستانوں کے شعرا یکجا ہوئے۔ یہاں سے اردو شاعری کا ایک نیا دبستان وجود میں آتا ہے جسے ہم رام پور کے دبستان سے جانتے ہیں۔۔۔۔ رام پور نے نہ صرف شعر و سخن میں نمایاں حصہ لیا بلکہ دوسرے علوم بالخصوص مذہب، تصوف، فنون لطیفہ اور ادب کے دیگر اصناف کے ارتقاء میں بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔'' [رضا لائبریری جرنل شمارہ ۲۔ ۱۹۹۵ء ص ۲۶۴]

دربار رام پور سے وابستہ ہونے والے اہل علم و ہنر میں دہلی اور لکھنؤ کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ریاست رام پور ہمیشہ ہی سے شعر و سخن اور علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے اور ایک زمانے میں یہ خطہ بخارائے ہند کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کے حکمرانوں نے مختلف مقامات سے آنے والے شعرا ادیبوں اور فن کاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی اور دیکھتے دیکھتے ہی رام پور اہل علم و ہنر کا مرکز بن گیا۔ اس دور کے قد آور شعرا جن میں مرزا غالب، داغ دہلوی، ظہیر دہلوی، امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی، جلال لکھنوی، اسیر لکھنوی بھی شامل ہیں۔ سب کے سب رام پور چلے آئے اور گویا وہ تمام شعری اور ادبی سرگرمیاں دربار رام پور کے حصے میں آئیں جن کے لیے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ شہرت رکھتے تھے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال داستان نگاروں کی تھی وہ داستان گو جو کبھی دہلی اور لکھنؤ میں اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے اب والیان ریاست رام پور کی قدر دانی کا شہرہ سن کر رام پور کھنچے چلے آئے۔ جہاں انھیں ایسا سازگار ماحول میسر آیا کہ وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو کر داستان نگاری کی طرف پورے انہماک سے متوجہ ہو گئے اور اپنی نگارشات کے ذریعے اردو داستانوں کے ذخیرے میں قابل قدر اور قابل لحاظ اضافہ کیا۔

دربار رام پور کی تمام داستانیں بجز معدودے چند ہنوز غیر مطبوعہ اور مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ داستانوں کا یہ ذخیرہ آج بھی کتب خانہ عالیہ رام پور کی زینت ہے۔ پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "رام پور کے کتب خانے میں ایک عجیب و غریب چیز داستانیں ہیں۔ وہاں کے درباری داستان گویوں نے طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کے انداز میں داستانیں تصنیف کیں اور ان ہی کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک سو پانچ جلدیں موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ ایک ایک کاپی ہے اس کی اور نقل نہیں اور ہر جلد ہزار بوا ہزار صفحے کی ہو گی۔ بہت بڑے سائز کی۔ جہاں تک ان کی زبانوں اور اسلوب کا تعلق ہے تو میری رائے میں

وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فسانہ عجائب یا مطبوعہ طلسم ہوش ربا کا۔ معلوم نہیں ان میں کیا کیا گوہر بند ہوں گے۔ کوئی ان کی سیر کرے تو معلوم ہو۔ میں نے ان کو الٹ پلٹ کے دیکھا ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ کوئی توقع نہیں کہ وہ کبھی شائع ہو سکیں گی۔ اور یہی بد قسمتی ہے کہ ہم ایسی زبان کے امین ہیں کہ جس میں اتنے ذخیرے ہیں اور جس کا خزانہ اتنا بیش بہا ہے لیکن ہمارے وسائل اتنے محدود ہیں کہ ہم ان کو محفوظ بھی نہیں کر سکتے۔" [ڈاکٹر حسن عباس۔ رضا لائبریری کی علمی میراث۔ ص ۱۰۰]

رام پور میں داستان نگاری کا آغاز ۱۸۲۵ء کے لگ بھگ ہوتا ہے اور تقریباً ایک سو سال، یعنی ۱۹۲۵ء میں اختتام کو پہنچتا ہے۔ نواب کلب علی خاں کا دور (۱۸۶۵-۱۸۸۷ء) داستان نگاری کا عہد زرین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں داستانوں کی ایک بڑی تعداد معرضِ وجود میں آئی۔ ذیل میں رام پور کے چند اہم داستان نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

لالہ انبا پرشاد رسا: رسا کے والد کا نام لال چند پرشاد تھا، قوم کے کائستھ تھے۔ وہ ابتدائی نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کے مصاحب تھے، بعد کو نواب محمد سعید خاں کے عہد میں رام پور پہنچ کر دربار شاہی کے داستان گویوں میں شمار ہونے لگے۔ میر احمد علی داستان گو سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ لالہ انبا پرشاد نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کا اسلامی نام عبدالرحمان ہے۔ [سہیل بخاری۔ اردو داستان۔ ص ۳۴۶] رسا نے تقریباً ۹۹ سال کی عمر میں ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۷ء کے درمیانی عرصے میں وفات پائی۔ لالہ انبا پرشاد رسا نے طوطی نامہ کی بیس حکایتوں کا "حکایات سخن سنج" کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔ ان کی دیگر تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کوچک باختر	(جلد اول ۱۸۵۳ء)	جلد دوم ۱۸۵۳ء)
	۱۶۱ اوراق	۳۶۷ اوراق
داستان امیر حمزہ		۱۵۷ اوراق

چہار رنگ	
داستان فرخ شاہ سوار قلندر	۲۷۹اوراق
دستان سلطانہ فتانہ	۱۰۵اوراق
	"۲۷
داستان ناہید باغبان	
داستان ہاشم تیغ زن	

ترجمہ نوشیروان نامہ	جلد اول	بعہد نواب کلب علی خاں	۴۷۸	اوراق
	جلد اول			
" "	دوم	" "	۴۷۴	
" "	سوم	" "	۴۸۹	
" "	چہارم	" "	۳۸۴	بعمر ۹۰ سال
" "	پنجم	" "	۴۶۵	
" "	ششم	" "	۳۲۵	

انبا پرشاد رسا کا اسلوب بیان صاف اور سادہ ہے لیکن بعض مقامات پر لکھنو اسکول کی داستانوں کی طرح عبارت میں تعقید اور رنگینی نمایاں ہے۔ رسا کے اسلوب تحریر کا نمونہ درج ذیل ہے

"بادشاہ نے کہا اے عمر اگر تو اس صحبت میں نہ جائے اور میرے حکم کی تعلیم کرنے پر راضی ہو تو اس وقت جو تو مجھ سے طلب کرے میں تجھ کو دوں۔ عمر نے جو یہ بات حسب دل خواہ اپنی زبان سے بادشاہ کے سنی نہایت خوش ہو کر کہا۔ اے بادشاہ عالم باغ داد میں حضرت اقدس و اعلیٰ کتنے دنوں تک رونق روز رہیں گے۔" [ڈاکٹر گیان چند اردو کی نثری داستانیں۔ ص ۷۰۹۔ ۷۱۰]

منشی غلام رضا:۔ غلام رضا نام، چھوٹے مرزا عرفیت اور رضا تخلص۔ مشہور داستان گو لالہ انبا پرشاد کے فرزند تھے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی دربار رام پور میں

ملازم تھے۔رضا نے ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔منشی غلام رضا صاحب تصانیف کثیرہ تھے جن کی تفصیل یہ ہے:[سہیل بخاری۔اردو داستان۔ص ۳۶۳]

طلسم باطن ہوش ربا	جلد اول	بعہد نواب کلب علی خاں	۳۰۸	اوراق
" "	جلد دوم	۱۸۷۶ء	۴۰۸	" "
" "	جلد سوم	۱۸۷۷ء	۴۵۷	" "
" "	جلد چہارم	" "	۴۶۵	" "
" "	جلد پنجم	۱۸۷۸ء	۳۸۴	" "
" "	جلد ششم	—	۴۸۸ء	" "
" "	جلد ہفتم	—	۴۸۰	" "
" "	جلد ہشتم	۱۸۷۹ء	۵۷۵	" "
" "	جلد نہم	—	۲۸۵	" "
" "	جلد دہم	۱۸۸۰ء	۴۸۵	" "
طلسم باطن بلاخیز	—	—	۱۶۱	" "
طلسم باطن آفات	—	۱۸۸۵ء	۴۳۹	" "
طلسم ضحاکیہ	—	—	۴۷۹	" "
طلسم نادر فرنگ		— —	۲۳۶	" "
طلسم باطن تیز نجات	—	—	۴۰۰	" "
طلسم نعمان	—	۱۸۸۶ء	۲۷۸	" "
ترجمہ لعل نامہ جلد اول	—	—	۷۱۰	" "
ترجمہ لعل نامہ جلد دوم	—	—	۶۹۲	" "

منشی غلام رضا کا انداز و اسلوب دبستان لکھنو کی داستانوں سے مطابقت رکھتا ہے ان کی زبان و بیان میں بلا کی صفائی اور روانی نظر آتی ہے۔غلام رضا کی انشا اپنے والد انبا پرشاد رسا کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ ہے نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اے سہمان شاہ شاہزادہ نورالدہر عالی شان نے تمام طلسم طائران کو زیر و زبوں کر کے تیری بیٹی کو مضمار جنی کے ہاتھ سے رہا کر کے یہاں بھیجا ہے اگر تجھ کو اطاعت شہزادہ نامور کی کنیزگی میں دینا منظور ہے تو جب تو جلد حاضر ہو کے اپنی بیٹی کو لے کے شہر میں داخل ہو اور منتظر آمد شہزادہ نامور کا نہ رہ اور اگر نہیں منظور ہے تو آمادہ مرگ رہ کہ اب چند روز میں شاہزادہ نامور بھی آیا چاہتا ہے۔"

[سہیل بخاری۔اردو داستان۔ص ۳۶۴]

حیدر مرزا:۔ میر نواب داستان گو کے بیٹے تھے، تصوران کا تخلص تھا۔ سید اصغر علی داستان گو سے تلمذ حاصل تھا۔ ریاست رام پور میں داستان گو کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے "گلستان مقال" اور "زرین نامہ" عرف "خورشید نامہ" کے نام سے دو داستانیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اول الذکر داستان جملہ پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ تمام جلدیں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ حیدر مرزا کی یہ دونوں داستانیں کتب خانہ عالیہ رام پور کی زینت ہیں اور ۱۳" × ۸ 1/2 " کی تقطیع کے پونے آٹھ ہزار اوراق پر مبنی ہیں [سہیل بخاری۔اردو داستان ص ۳۶۰] حیدر مرزا کی داستانوں میں بقول سہیل بخاری سادہ و سلیس دقیق و رنگین ہر قسم کی عبارت کے نمونے ملتے ہیں۔ ہر داستان کا آغاز عموماً مقفیٰ و مسجع عبارت سے کرتے ہیں لیکن آگے چل کر ان کے اسلوب میں سادگی و سلاست آجاتی ہے۔ رزم بزم کے نقشے، منظر نگاری اور تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی میں ان کی داستانوں میں لکھنو اسکول کی داستانوں کا لطف آجاتا ہے۔ حیدر مرزا کے اسلوب کا نمونہ درج ذیل ہے:

"محرران سحر تقریر و منشیان جادو اس داستان بے نظیر کو بکاغذ حریر اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ جس وقت زمرد ثانی از تائید آسمانی قتل ہو کے داخل مبہم و اسفل السافلین ہوا اور تمام کفار اکناف عالم میں منتشر ہو گئے تو خدا پرستوں کی فتح ہوئی۔" [ایضاً ص ۳۶۲]

حکیم سید اصغر علی خاں: اصغر لکھنو کے نامور داستان گو تھے ابتداء میں دربار اودھ میں ملازم رہے اور پھر سلطنت اودھ کے زوال کے بعد لاہور کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دوران قیام لکھنو انہوں نے "قصہ روشن جمال"، "قصہ پروین" داستان غزالہ" وغیرہ تصنیف کی تھی رام پور کی سرکار سے وابستہ ہونے کے بعد انہوں نے درج ذیل تصانیف سپرد قلم کی ہیں: [ایضاً ص ۳۵۷]

ایرج نامہ جلد اول	۱۸۶۸ء	۳۶۴	اوراق بعہد نواب کلب علی خاں
" جلد دوم	"	۳۵۱	" "
" جلد سوم	"	۳۳۶	" "
" جلد چہارم	"	۳۳۶	" "
" جلد پنجم	"	۳۰۶	" "
داستان نیلم جادو	"	۲۳۷	"
طلسم ہفت کواکب	"	۱۱۷	"
داستان شمالہ باختر	"	۱۴۰	"

اصغر علی کی زبان عام فہم اور رواں ہے لیکن بعض مقامات پر جملے غیر متناسب ہوتے ہیں بقول ڈاکٹر سہیل بخاری ان کی تحریر بالعموم تقریر سے مشابہہ ہے عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے:

"نور الدہر نے پہچانا کہ یہ خورشید ستارہ پرست ہے خورشید نور الدہر کو دیکھ حیران ہوا کہ یہ بھی یہاں گرفتار ہے باہم اشاروں میں باتیں ہونے لگیں مشکل اور مسلسل ہیں دونوں بیٹھی ہوتی ہیں۔"

صحبت رقص برپا ہے ہر طرح سے چاہتی ہے کہ یہ ہماری طرف مخاطب ہوں نور الدہر اور خورشید التفات نہیں بلکہ ان سے بات نہیں کرتے۔" [ایضاً ص ۳۵۸]

مرزا علیم الدین :

علیم الدین کے والد کا نام مرزا رحیم الدین حیا تھا۔ کمسنی میں وہ اپنے والد کے ہمراہ رامپور چلے آئے۔ علیم الدین نے ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ وہ ایک کثیر التصانیف مصنف تھے۔ بقول پروفیسر گیان چند جین "ان کی تصانیف کی تعداد منشی غلام رضا سے بھی زیادہ ہے۔" [اردو کی نثری داستانیں ص ۷۲۳] ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> "مصنف نے داستان امیر حمزہ جدید کی کئی جلدوں کے علاوہ کتنے ہی طلسمات تحریر کئے ہیں یہ سب کی سب کتابیں لکھنوی داستانوں کی باقیات میں شمار کی جاسکتی ہیں کیونکہ ان کے نہ صرف واقعات بلکہ بیانات کا سلسلہ بھی لکھنو سے ملتا ہے۔ مصنف کی انفرادیت صرف ان کی انشاء پردازی تک محدود ہے جس کا سلسلہ نسب دہلوی انشاء پردازوں تک پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں تصنع اور تکلف کی جگہ سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود زبان میں چاشنی اور قصہ گوئی کی لطافتیں ملتی ہیں۔" [اردو داستان۔ ص ۳۷۳]

دربار رام پور کے دیگر داستان نگاروں میں غلام علی عشرت (داستان سحر البیان) احمد علی غفلت (فسانہ رام و سیتا) احمد علی رسا (چہار شہزادہ) صغیر علی مروت (گلدستہ عجائب رنگ) حسین علی خاں خیالی (داستان ہندی ترکی) محمد عباس علی خاں بیتاب (گلزار عشق۔ بہار عشق) نواب محمد کلب علی خاں (بلبل نغمہ سنج) حیدر علی خاں (جادہ تسخیر) منیر شکوہ آبادی (طلسم گوہر بار) سید عابد علی (فسانہ مجموعہ گلزار عشق) امیر خاں (گلستان مسرت) مرزا مرتضیٰ حسین وصال (طلسم بوقلموں) محمد اسحاق (طلسم کن فیکون) جلال لکھنوی (بالا باختر) میر احمد علی (طلسم طہمورث دیو بند) کے نام لائق ذکر ہیں۔

اردو داستان نویسی کی تاریخ میں رام پور کی داستانوں کی اہمیت مسلم ہے۔ کلکتہ،

لکھنو اور دیگر ادبی مراکز کے مقابلے میں رام پور کی داستانوں کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہے۔ زوال سلطنت دہلی اور لکھنو کے بعد دونوں مقامات کے اہم داستان نویس رام پور میں جمع ہو گئے۔ رام پور کی داستانیں لکھنو کی داستانوں کے مقابلے میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہیں لیکن زبان و بیان اور طرز و تحریر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے لکھنو اور رام پور اسکول کی داستانوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے بالکل صحیح رائے قائم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "مواد اور اسلوب تحریر دونوں کے اعتبار سے لکھنوی اور رام پوری داستانیں یکساں نظر آتی ہیں۔ لیکن رام پور کا کارنامہ لکھنو کے مقابلے کئی لحاظ سے بڑھا ہوا ہے۔ اول یہ کہ رام پور نے لکھنو سے بہت زیادہ داستانیں پیش کیں جن میں داستان امیر حمزہ کے کئی نقوش، اس کے جملہ دفاتر اور پھر ان کے متعلقات شامل ہیں۔ دوم یہ کہ رام پور میں جتنے طلسمات تحریر ہوئے وہ سب کے سب طبع زاد ہونے کے علاوہ تعداد میں بھی اتنے زیادہ تھے کہ لکھنوی طلسمات کا سرمایہ ان کے سامنے گرد ہو گیا۔ یہ طلسمات رام پور کی واحد اور بلا شرکت غیرے ملکیت ہیں۔ سوم یہ کہ رام پور میں صرف ایک داستان گلستان مقال ہی ایسی لکھی گئی ہے جس کا سلسلہ پندرہ جلدوں میں پھیلا ہوا ہے اور جسے بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ [۱۳۔ ڈاکٹر سہیل بخاری۔ اردو داستان۔ ص ۲۸۷]

○ ○ ○

پریم چند کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ

پریم چند اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سب سے اہم اور قدآور تخلیق کار ہیں۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۱/ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس کے قریب ایک گاؤں ملہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، بعد کو انھوں نے بنارس کے کالجیٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ ملازمت سے وابستہ ہونے کے ایک عرصہ کے بعد انھوں نے خانگی طور پر بی۔اے کا امتحان بھی کامیاب کیا تھا اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ تک پہنچے۔ پریم چند نے چوں کہ جذبۂ حب الوطنی کے زیر اثر افسانہ نگاری کی ابتداء کی تھی۔ اس لیے ان کے اولین افسانوں میں آزادی کی خواہش اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا رجحان نمایاں تھا۔ جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن "جون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تو سرکاری حلقوں میں بڑے غیض و غضب کا اظہار کیا گیا اور اس کتاب کی دستیاب جلدوں کو ضبط کر کے ضائع کر دیا گیا۔ "سوزِ وطن " کے ناشر دیا نرائن نگم کا بیان ہے کہ:

حکومت کے ظلم و زیادتی نے پریم چند کے جذبۂ حب الوطنی کی آگ کو اور بھڑکایا۔ مذکورہ کتاب کی ضبطی کے بعد "زمانہ" (کانپور) میں ان کی تین کہانیاں "گناہ کا اگن کنڈ"، "سیرِ درویش" اور "رانی سارندھا" مصنف کے نام کے بغیر شائع ہوئیں۔ پریم چند نے فروری ۱۹۲۱ء سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد، دیانرائن نگم کے مجوزہ قلمی نام "پریم چند" سے لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے ایک رسالہ "ہنس" جاری کیا تھا اور کچھ عرصے تک "مادھوری" کے مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ آخری عمر میں انھوں نے فلموں کے لیے کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ پریم چند نے ۸/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو بنارس میں وفات پائی۔

پریم چند کا پہلا طبع زاد افسانہ "عشق دنیا اور حب وطن" رسالہ زمانہ (کانپور) اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا (۲)۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے جون ۱۹۰۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پریم چند "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ پریم چند کا پیدائشی نام دھنپت رائے تھا۔ لیکن ان کے والد پیار سے انھیں "نواب" پکارا کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا پہلا قلمی نام "دھنپت رائے" اختیار کیا۔ پریم چند کے نام سے ان کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' "زمانہ" دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر جعفر رضا نے اپنی کتاب "پریم چند فن اور تعمیرِ فن" میں ان کی ۳۰۳ کہانیوں کا گوشوارہ شائع کیا ہے (۳)۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد بعض اہل قلم نے چند کہانیوں کو مشکوک قرار دیا ہے اور بعضوں نے قدیم رسائل میں پریم چند کی کچھ اور کہانیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس لیے ان کی کہانیوں کی مجموعی تعداد کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

پریم چند کے اب تک ۱۴/ افسانوی مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

	مجموعے کا نام	سالِ اشاعت	کہانیوں کی تعداد
(۱)	سوزِ وطن	۱۹۰۸ء	۵
(۲)	پریم پچیسی حصہ اول	۱۹۰۵ء	۱۲
(۳)	پریم پچیسی حصہ دوم	۱۹۱۸ء	۱۳

(۴) پریم بتیسی حصہ اول	۱۹۲۰ء	۱۵
(۵) پریم بتیسی حصہ دوم	۱۹۲۰ء	۱۹
(۶) خاک پروانہ	۱۹۲۸ء	۱۹
(۷) خواب و خیال	۱۹۲۸ء	۱۴
(۸) فردوس خیال	۱۹۲۹ء	۱۱
(۹) پریم چالیسی حصہ اول	۱۹۳۰ء	۲۰
(۱۰) پریم چالیسی حصہ دوم	۱۹۳۰ء	۲۰
(۱۱) آخری تحفہ	۱۹۳۴ء	۱۳
(۱۱) زاد راہ	۱۹۳۶ء	۱۵
(۱۳) دودھ کی قیمت	۱۹۳۷ء	۹
(۱۴) واردات	۱۹۳۸ء	۱۳

آخر الذکر دو مجموعے پریم چند کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ ان مجموعوں میں "سیر درویش" اور "کفن" جیسی بے مثال کہانیوں کے علاوہ ہندی سے اخذ و ترجمہ کی گئی طویل کہانی "روٹھی رانی" (۱۹۰۷ء) بھی شامل نہیں ہے (۴)۔

پریم چند نے ۱۹۰۱ء میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی افسانہ نگاری ۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۶ء تک تیس سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ مانک ٹالا کی تحقیق کے مطابق پریم چند کی طویل کہانی "روٹھی رانی" زمانہ (کانپور) میں ۱۹۰۷ء میں دو قسطوں میں شائع ہوئی اور "سوز وطن" کی اشاعت ۱۹۰۸ء میں عمل میں آئی۔ ان شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ پہلے افسانوی مجموعہ کی اشاعت سے پہلے اس کتاب کے دو ایک افسانے ضبط تحریر میں ضرور آئے ہوں گے۔ پریم چند کے تخلیقی سفر کے مطالعہ کے سلسلہ میں ان کی افسانہ نگاری کو درج ذیل تین ادوار میں تقسیم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(۱) پہلا دور	۱۹۰۷ء	-	۱۹۱۷ء
(۱) دوسرا دور	۱۹۱۸ء	-	۱۹۳۰ء
(۱) تیسرا دور	۱۹۳۱ء	-	۱۹۳۶ء

پہلے دور کے افسانوں میں پریم چند ایک طرف رومانی اور داستانی طرزِ نگارش سے اثر پذیری کی وجہ سے افسانہ نگار کم اور قصہ گو زیادہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر انگریزوں کی بربریت اور استبداد کے ردعمل کے طور پر وطن پرستی کے جذبات سے خود بھی سرشار معلوم ہوتے ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو بھی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے، غلامی کا جوا اتار پھینکنے، ایثار و قربانی سے کام لینے اور منزل دار و رسن کی طرف بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" پانچ کہانیوں (۱) دنیا کا سب سے انمول رتن (۲) شیخ مخمور (۳) یہی میرا وطن ہے (۴) صلہ ماتم اور (۵) عشق دنیا اور حب وطن پر مشتمل ہے۔ چوتھے افسانے (صلہ ماتم) کو چھوڑ کر اس مجموعے کے سبھی افسانے وطن پرستی کے جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے افسانے میں خصوصی طور پر داستانی فضا اور شاعرانہ رنگ نمایاں ہے۔ کہانی کا انجام طربیہ ہے خیر کو شر پر کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ کرداروں کی حرکات و سکنات، ان کے سوچنے کے انداز اور مکالموں پر بھی رومانی رنگ اور مصنوعی انداز کی چھاپ ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں "سوزِ وطن" کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن میں رومانی فضا اور داستانی رنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قصہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیے ایک داستانی رنگ ملے گا۔ ملکہ کی شرط، دل نگار کی دو سفروں میں ناکامی اور تیسرے سفر میں "بزرگ سبز پوش" کی رہنمائی سے گوہر مراد کا پانا۔ یہ سب ہماری داستانوں کا لازمی جزو ہیں۔ افسانے کی زبان تک داستانی ہے۔ مثلاً: "بالآخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم اور درِ صدف محبوبی کے در دولت پر جا پہنچا اور پیغام دیا کہ دل فگار سرخرو کامگار لوٹا ہے اور دربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔" یہاں تک کہ اس چھوٹی سی کہانی میں کوہ و صحرا اور دریا کا جو سماں دکھایا ہے وہ بھی انھیں مقررہ الفاظ میں کہا ہے جنھیں ہم داستانی کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً: مدتوں تک پرخار جنگلوں، شرربار ریگستانوں، دشوار گذار وادیوں اور ناقابلِ عبور

پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا اور ایک خوش گوار چشمے میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبہ ماندگی سے لب جوئبار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے ایک کف دست میدان میں پہنچا ..... " افراد قصہ کے ناموں میں بھی داستانی طرز کا علامتی رنگ ہے۔ مثلاً " دل فگار عاشق ہے۔ معشوق دل فریب ہے۔ " درحقیقت یہ افسانہ سمٹی ہوئی داستان ہے۔ اگر پریم چند اس کو داستان بنانا چاہتے تو بہت آسانی سے دل فگار کے تین سفروں کو طول دے کر اس میں طلسم کا عنصر شامل کرکے (سبز پوش بزرگ تو موجود ہی ہیں) ایسا کر سکتے تھے اور اس طرح یہ حاتم طائی کی " ہفت سیر حاتم " کے مقابلے " سہ سیر دل نگر " بن جاتی " (۶)۔

پریم چند نے قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبے کے زیر اثر اسی دور میں اپنی قوم میں جذبہ حریت کو بیدار کرنے اور عظمت رفتہ کا احساس دلانے کے لیے تاریخی افسانے بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اس قبیل کے افسانوں میں " رانی سارندھار " (۱۹۱۰ء) " گناہ کا اگن کنڈ " (۱۹۱۰ء) " راجا ہردول " (۱۹۱۱ء) اور " آلھا " (۱۹۱۲ء) کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چوں کہ ان افسانوں کے پلاٹ تاریخی حقائق پر مبنی ہیں اس لیے طوالت کے باوجود ان میں دل بستگی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ " پریم پچیسی " کے تاریخی افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

" پریم پچیسی کے تاریخی افسانے یقیناً " سوز وطن " کے افسانوں پر ہر اعتبار سے فوقیت رکھتے ہیں ان میں فنی تکمیل کا احساس کافی حد تک ملتا ہے۔ یہ داستان کا بلکہ تاریخ کا ورق ہیں۔ اس لیے ان کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ پلاٹ تاریخی واقعات سے اخذ کیے گئے ہیں اس لیے دل چسپ اور طویل ہیں۔ مگر ان قصوں کو لکھتے وقت مصنف کا قلم غیر ارادی طور پر سرعت سے چلنے لگا ہے ..... ایک نیا عنصر جو ان افسانوں میں جگہ پاتا ہے۔ منظر کشی ہے۔ منظر نگاری میں پریم چند نے غضب کا کمال دکھایا ہے " (۷)۔

پریم چند نے اپنے ابتدائی دور کی کہانیوں میں اپنے پیش رو تخلیق کاروں جیسے سرت چندر، ٹیگور اور ٹالسٹائی کا اثر قبول کیا اور بہت جلد اپنے فکر و فن کی بنیاد پر انھوں نے ایک نئی اور منفرد تخلیقی دنیا آباد کر لی۔ ہندوستانی دیہات اور ان میں رہنے بسنے والے غریب، محنت کش اور ان پڑھ عوام ان کے افسانوں اور ناولوں کا محور و مرکز ہیں۔ پریم چند خود چوں کہ ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا، غلامی لعنتوں، مہاجنوں اور زمین داروں کے مظالم، ہریجنوں، محنت کشوں، بیواؤں اور اچھوتوں کے دکھ درد، بھوک، بیماری اور افلاس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے اپنے افسانوں اور ناولوں میں دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کی متاثر کن، سچی اور حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کے موضوع میں جو تبدیلی پیدا کی اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

"کہانیوں کا موضوع بادشاہوں، شہزادوں، جنوں اور پریوں سے نیچے اتر کر خاص قسم کے انسانوں تک پہنچ گیا تھا لیکن یہ پریم چند ہی کا کام تھا کہ انھوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا اور اس دنیا کی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جاندار اور سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی مظہر تھی۔ یہی نہیں بلکہ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اردو اور ہندی میں پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا۔"

(پیش لفظ "پریم چند" از ہنسراج رہبر)

سردار جعفری پریم چند کی ادبی تخلیقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پریم چند کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے بڑی سچائی اور شدت کے ساتھ کسانوں کی ذہنی حالت اور درمیانی طبقے کے نقطۂ نظر کو اس وقت پیش کیا جب ہندوستان میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ بیرونی اقتدار کے خلاف قومی جدوجہد کے اس دور میں

کسانوں کی معیشت اور زندگی کے پرانے ڈھانچے ٹوٹ رہے تھے۔
انھوں نے اپنے ادب میں اس نفرت اور تلخی کی تصویر کشی کی ہے جو
کسانوں کے دل میں معاشی استحصال اور ظلم کے خلاف جمع ہو گئی
تھی۔" (ترقی پسند ادب ص ۱۲۷۔۱۲۸)

دیہات میں پروہت، مہاجن، زمین دار اور اعلیٰ طبقے کے افراد جس طرح ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں اس کی موثر ترجمانی پریم چند کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لینے والے ان پڑھ اور جاہل مرد اور خواتین ہیں لیکن ان غریبوں کو نام نہاد تعلیم یافتہ انسانوں، برہمنوں، ساہوکاروں اور حکومت کے عہدہ داروں کے ہاتھوں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی بولتی ہوئی تصویریں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ "پریم پچیسی" کے افسانے "بے غرض محسن" (۱۹۱۰ء) "صرف ایک آواز" (۱۹۱۳ء) "اندھیرا" (۱۹۳۱ء) "خون سفید" (۱۹۱۴ء) اس دور کے ایسے نمائندہ افسانے ہیں، جن میں غریب کسانوں، ہریجنوں، ان پڑھ دیہاتیوں اور محنت کشوں کی بے دست و پائی، مفلوک الحالی، مجبوری اور محتاجی کی ختم نہ ہونے والی داستان حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر قمر رئیس "پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے، انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساسِ جمال سے آشنا کیا اس طرح اردو ادب جو اب تک شہر کے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی ترجمانی کرتا تھا، سارے ملک کی متحرک زندگی، عوامی تحریکوں، سماجی آویزشوں اور عام انسانوں کے مشغلوں اور معرکوں کا جاندار مرقع بن گیا" (۸)۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک تیرہ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں ایک طرف وہ اصلاحی افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور دوسری طرف ان کی کہانیوں میں مقصدیت کا عنصر اور سیاسی رنگ بھی نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اس عہد کے افسانوی مجموعوں میں "پریم پچیسی" (حصہ دوم ۱۹۱۸ء)،

"پریم بتیسی" (حصہ اول و دوم ۱۹۲۰ء)، "خاک پروانہ" (۱۹۲۸ء)، "خواب و خیال" (۱۹۲۸ء) اور "فردوس خیال" (۱۹۲۹ء) شامل ہیں۔

تاریخی اور سیاسی نقطہ نظر سے یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ۱۹۱۷ء میں روس کا عظیم اکتوبر انقلاب کامیاب ہوا۔ یہ کامیابی نہ صرف اہلِ روس کے مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ عوام کو افلاس اور جہالت سے نجات دلانے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی بلکہ ساری دنیا کے محنت کش طبقے کے لیے کامیابی و کامرانی کا مژدہ بھی تھی۔ روسی انقلاب سے متاثر ہو کر پریم چند اپنے ملک کے زمین داروں اور تعلقہ داروں کو اس طرح متنبہ کرتے ہیں:

"..... اگر قوم میں انسانیت اور لاج شرم نہیں ہے تو (بھی) اپنی بھلائی کا تقاضا ہے کہ ہم ابھی سے جنتا کے دل کو بس میں کرنے کی کوشش کریں۔ اس بات میں ہمارے تعلقہ دار اور زمین دار، چاہے وہ اندھیرے اودھ کے ہوں یا اجالے بنگال کے، سب سے زیادہ موردِ الزام ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ وہ مستقبل کے نقصان کی فکر نہ کر کے کسانوں کی بھلائی اور سدھار کی کوشش کریں کیوں کہ آنے والا زمانہ اب جنتا کا ہے اور وہ لوگ پچھتائیں گے جو زمانے کے قدم سے قدم ملا کر نہیں چلیں گے" (۹)۔

۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگ عظیم اختتام کو پہنچتی ہے تو انگریزی حکومت نے تحریک آزادی ہند کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ پاس کر دیا۔ اس ایکٹ کی مخالفت میں ملک کے رہنماؤں نے ستیہ گرہ اور عدم تعاون کے مظاہرے کیے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ رونما ہوا۔ جس میں بے شمار نہتے لوگوں کا قتل عام کیا گیا تھا ان تمام واقعات پر پریم چند کی نظر تھی۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے افق پر گاندھی ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہو چکے تھے۔ پریم چند گاندھی جی کے نظریات سے ابتداء سے متاثر تھے اور جب انھوں نے ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف ترک موالات پر گاندھی جی کی تقریر سنی تو سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اپنی آپ بیتی میں وہ لکھتے ہیں:

"یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہو چکا تھا۔ انھیں دنوں گاندھی جی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا...... مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آگئی اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا" (۱۰)۔

سرکاری ملازمت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد وہ نہ صرف جدوجہد آزادی کی تحریکوں کے بہت قریب آگئے تھے بلکہ ان کا قلم پوری آزادی اور اعتماد کے ساتھ چلنے لگا اب وہ ہمہ وقتی طور پر پورے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں اس دور کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے موثر اور حقیقی مرقعے محفوظ ہوگئے ہیں۔ "بھاڑے کا ٹٹو"، "ستیہ گرہ"، "قاتل"، "جیل"، "عجیب ہولی" ایسی کہانیاں ہیں جن میں اس عہد کی بچی اور بولتی ہوئی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ پریم چند نے اس دور میں بعض کہانیاں ایسی لکھی ہیں جس میں اس زمانے کی سیاسی تحریکوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پریم چند جدوجہد آزادی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ جب وہ عملی طور پر اس جدوجہد میں شامل نہیں ہوسکے تو انھوں نے قلم کے ذریعہ اس میں شرکت کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیٹے ہندی کے معروف ادیب امرت رائے نے ان پر جو کتاب لکھی ہے اس کا عنوان ہے "قلم کا سپاہی"۔ اس قلم کے سپاہی نے سیاسی تحریکوں کو موضوع بنا کر جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں "آخری تحفہ" بڑی ہی موثر کہانی ہے۔ جب ہندوستان میں سودیسی تحریک چل رہی تھی اس تحریک کا مقصد تھا کہ صرف دیسی چیزیں استعمال کی جائیں اور کوئی بھی ولایتی یا بدیسی چیز استعمال نہ کی جائے۔ "آخری تحفہ" میں اسی تحریک کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک صاحب اپنی محبوب کی فرمائش پر ولایتی ساڑی خریدنا چاہتے ہیں لیکن دکانوں پر سودیسی تحریک کے کارکن مظاہرہ کرتے ہیں اور بدیسی چیزوں کو خریدنے پر پابندی لگا دیتے ہیں لیکن یہ صاحب ولایتی ساڑی خریدنے کے لیے دکان کے پچھلے

دروازے سے اندر جاتے ہیں اور ساڑی خرید کر جب واپس ہوتے ہیں تو ایک سودیسی تحریک میں حصہ لینے والی خاتون انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی ہے۔ انھیں بدیسی چیزیں نہ خریدنے پر آمادہ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھیں کسی کی فرمائش پوری کرنی ہے۔ کارکن خاتون ان کے ساتھ جاتی ہے اور فرمائش کرنے والی کو بدیسی چیزوں کے استعمال نہ کرنے لکچر دیتی ہے۔ جس پر وہ خاتون برہم ہوجاتی ہے اور کارکن خاتون پر نازیبا جملے کستی ہے۔ یہ صاحب کارکن خاتون کے جذبہ، حب الوطنی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس خاتون کو ولایتی ساڑی واپس دینے کے لیے کہتے ہیں۔ جس کے لیے وہ آمادہ نہیں ہوتی۔ اس کی ضد کو دیکھ کر یہ صاحب کہتے ہیں کہ اگر تم یہ ساڑی واپس نہ کروگی تو یہ میرا "آخری تحفہ" ہوگا۔ اور "آخری تحفہ" دے کر وہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ لیکن پریم چند کی افسانہ نگاری کا کمال ان کہانیوں میں بام عروج پر نظر آتا ہے جن میں انھوں نے دیہی زندگی اور اس کے مسائل کو اپنی فکر و نظر کی جولانگاہ بنایا ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں "پوس کی رات"، "علاحدگی"، "سجان بھگت"، سوا سیر گیہوں"، "مزار آتشیں" کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

"پوس کی رات" اس دور کی منتخب کہانیوں میں سے ایک ہے جس میں پریم چند نے ایک غریب اور مقروض کسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبتوں کی کہانی بیان کی ہے۔ ہلکو ایک مفلوک الحال کسان ہے جس نے پیسہ پیسہ کر کے تین روپے جمع کیے تھے۔ تاکہ پوس کی رات میں سردی سے بچنے کے لیے ایک کمبل خرید سکے لیکن اپنے قرض خواہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالیوں کے خوف سے ہلکو نے سردی میں ٹھٹرنا گوارا کرلیا۔ "ہلکو تھوڑی دیر کے لیے چپ چاپ کھڑا رہا اور وہ اپنے دل میں سوچتا رہا کہ پوس سر پر آگیا ہے۔ بغیر کمبل کے رات کو وہ کسی طرح کھیت پر نہیں سو سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں گھڑکیاں دے گا، گالیاں سنائے گا۔ بلا سے جاڑے میں مریں گے یہ بلا تو سر سے ٹلے گی" (۱۱)۔ جب پوس کی خون منجمد کر دینے والی رات میں ہلکو کو اپنے کھیت کی حفاظت کے لیے جانا پڑا تو اس کا ساتھی کتا جبرا بھی اس کے ساتھ ہوگیا۔ پوس کی برفیلی رات میں ہلکو نے کبھی چلم سے اپنا من بہلانے کی کوشش کی اور کبھی دونوں گھٹنوں

کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپانے کی کوشش کی۔ جبرا سردی سے پیٹ میں منہ ڈالے
کوں کوں کر رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ باقی تھی۔ ہلکو نے اطراف سے پتیاں بٹور
کر انھیں جلایا اور آگ تاپنے لگا۔ جبرا بھی دم ہلاتا ہوا قریب آیا اور تھوڑی دیر بعد وہ
بھونکتا ہوا کھیت کی طرف لپکا۔ ہلکو نے محسوس کیا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے
کھیت میں آگیا۔ اس نے جانوروں کے چرنے کی آواز بھی سنی مگر اس سرد رات میں
کھیت کی طرف جانا، جانوروں کا پیچھا کر کے انھیں بھگانا اسے پہاڑ معلوم ہوا۔ صبح جب
وہ نیند سے بیدار ہوا تو چاروں طرف دھوپ پھیل گئی تھی اور منی سامنے کھڑی کہہ
رہی تھی "تم کہاں آکر مرگئے ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔" پریم چند کے سبھی
نقادوں نے اس کہانی کو ہر جہت سے کامیاب قرار دیا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر گوپی چند
نارنگ:

> "اس کہانی میں (پوس کی رات میں) پریم چند نے ایک بڑی دردناک
> صورت حال کو سفاکانہ معروضیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور زمین
> داری کے لگائے ہوئے گھاؤ کو طنز کے نشتر سے کریدا ہے۔ یہ کہانی
> بھی IRONY کی سطح پر سانس لیتی ہے۔ پلاٹ کی تعمیر اور مکالموں
> کو ایک کے بعد ایک بنا ہی اس طرح گیا ہے کہ ایسی صورت حال
> سامنے آئے جو بنیادی طور پر طنزیہ ہو، لیکن اس سے پیدا ہونے والا
> تاثر انسان کی بے بسی اور مجبوری کے درد سے دل کو تڑپا دے" (۱۲)

پریم چند کے افسانوی سفر کا تیسرا دور ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک چھے برسوں پر محیط ہے۔
اس دور میں ان کے نظریات و تصورات میں نمایاں تبدیلیاں آئیں اور انھوں نے اپنے
وسیع نفسیاتی مطالعہ اور انسانی فطرت کے عمیق مشاہدے سے کام لیتے ہوئے اپنی
کہانیوں کو حقیقت نگاری اور واقعیت سے قریب تر کر دیا۔ ان چھے برسوں میں پریم
چند کے دو افسانوی مجموعے "آخری تحفہ" (۱۹۳۴ء) اور "زاد راہ" (۱۹۳۶ء) شائع ہوئے
اور ان کی وفات کے بعد دو اور مجموعے "دودھ کی قیمت" (۱۹۳۷ء) اور "واردات"
(۱۹۳۸ء) منظر عام پر آئے۔ لیکن یہ دونوں مجموعے پریم چند کے زمانہ۔ حیات ہی میں

مرتب ہو چکے تھے (۱۳)۔

نجات، دودھ کی قیمت، کفن، جرمانہ، مس پدما، نئی بیوی، نوک جھونک اور مالکن اس دور کی نمائندہ کہانیوں میں شامل ہیں۔ اول الذکر چار کہانیوں میں طبقاتی کشمکش، استحصال اور ظلم و استبداد کے خلاف غم و غصے کا اظہار اور کہیں کہیں نفرت اور حقارت کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جب کہ آخر الذکر چار افسانوں میں عورت کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے اور آزادیِ نسواں کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

"نجات" اس دور کی بلاشبہ ایک قابلِ توجہ کہانی ہے جس میں ہندوستانی سماج کی طبقاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے دو نمائندہ کرداروں دکھی (چمار) اور پنڈت کی سیرت کی بڑی ماہرانہ تصویر کشی کی ہے۔ دکھی، نیچ ذات یا ادنیٰ طبقے کا نمائندہ ہے۔ جسے اس کی معاشی ابتری اور اونچ نیچ کے بھید بھاؤ کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ ایک طرف وہ محنت و مشقت کا عادی ہے تو دوسری طرف فرماں برداری اور بے زبانی کا مجسمہ بھی ہے۔ پنڈت کے حکم پر وہ بھوکے پیٹ ایسے کام کرنے پر مجبور ہے جو اس کے بس کے نہیں۔ اس کی عاجزی اور بے بسی بھوک اور لاچارگی کا اظہار تک کرنے نہیں دیتی۔ اپنی بیٹی کی شادی کی مہورت نکلوانے کے لیے وہ پنڈت کے گھر آیا تھا لیکن پنڈت کے حاکمانہ رویے سے مجبور ہو کر وہ بغیر معاوضے کے محنت کرتا ہے اور آخرکار اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

پنڈت جی کا کردار اعلیٰ ذات، مذہبی تقدس اور مذہبی اجارہ داری کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پنڈت کے ظلم اور غیر انسانی رویہ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا۔ ایک گونڈ چماروں کو دھمکاتا ہے کہ دکھی کی لاش کوئی نہ اٹھائے۔ پولیس پنچ نامے کو آئے گی۔ لیکن وہ بھی اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ پنڈت کے روبرو اس کے جرم کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ پنڈت پوجا پاٹ کر کے عقیدت مندوں سے نذرانہ وصول کرتا ہے۔ چمار یا نیچ ذات کے لوگ اس کے لیے جانوروں سے بھی کم تر درجہ رکھتے ہیں۔ وہ چمار سے سخت محنت کرواتا ہے لیکن اس کو کھانا کھلانا یا اس کی راحت کا

خیال کرنا گناہ سمجھتا ہے۔جب دکھی کی لاش سے بدبو پھیلنے لگتی ہے تو "پنڈت نے ایک رسی نکالی۔اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔پنڈت نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے... ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔یہی اس کی تمام زندگی کی بھکتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا" (۱۴)۔

پریم چند عام فہم اور بول چال کی زبان میں لکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں نہ عربی اور فارسی کے الفاظ کی فراوانی ہے اور نہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کا عمل دخل۔ان کے طرز نگارش میں بھی سادگی، روانی، بے تکلفی اور واقعہ نگاری کی شان نظر آتی ہے۔بہ قول ڈاکٹر قمر رئیس "فکر و اظہار کا یہی وہ سادہ اور حقیقت پسندانہ اسلوب ہے جو اردو افسانہ میں پریم کی روایت کے تحفظ اور تسلسل کی شناخت بن گیا ہے" (۱۵)۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر قمر رئیس۔پریم چند۔فکر و فن۔ص ۱۶۔۱۷۔

(۲) ڈاکٹر قمر رئیس۔پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ص ۱۴۔

(۳) ڈاکٹر جعفر رضا۔پریم چند۔فن اور تعمیر فن۔ص ۱۱۰۔

(۴) مانک ٹالا کی تحقیق کے مطابق "روٹھی رانی" زمانہ (کانپور) میں اپریل مئی (مشترکہ شمارہ) اور اگست ۱۹۰۷ء میں دو قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔بہ حوالہ پریم چند اور تصانیف پریم چند۔ص ۱۵۰۔

(۵) ایضاً

(۶) بہ حوالہ اردو افسانہ روایت اور مسائل مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ص ۱۴۸۔

(۷) ایضاً

(۸) ڈاکٹر قمر رئیس۔پریم چند۔فکر و فن۔ص ۸۷۔۸۸۔

(۹) مانک ٹالا۔پریم چند۔کچھ نئے مباحث۔ص ۱۳۔

(۱۰) به حوالہ پریم چند۔ فکر و فن۔ ص ۲۰-۱۱۔

(۱۱) پریم چند کے منتخب افسانے از ڈاکٹر قمر رئیس۔ ص ۱۰۰۔

(۱۲) مقالات یوم پریم چند۔ "افسانہ نگار پریم چند"۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنو۔ ص ۱۷۔

(۱۳) مانک ٹالا۔ پریم چند کچھ نئے مباحث۔ ص ۱۴۷۔

(۱۴) ڈاکٹر قمر رئیس۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ ص ۱۴۲۔

(۱۵) ایضاً۔ ص ۳۲۔

○ ○ ○

علی گڑھ تحریک

۱۸۵۷ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں، سیاسی، سماجی اور ادبی نقطہ نظر سے ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال ہندوستانیوں نے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک عظیم الشان کوشش کی تھی جو ناکام رہی۔ اسی سال ہندوستان پر غیر ملکی حکومت مسلط ہو گئی اور پھر اس تسلط کے زیر اثر ملک میں کئی سماجی، معاشرتی اور ادبی انقلابات رونما ہوئے۔ مغربی علوم و فنون اور خصوصاً انگریزی زبان کی وساطت سے ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے افکار و خیالات میں گیرائی اور گہرائی پیدا ہوئی۔

سترھویں صدی سے انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں وارد ہونے لگے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام تک وہ ملک کے کچھ حصوں کے حکمران بن گئے۔ اور انیسویں صدی کے ربع دوم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں، ان کا اقتدار ہندوستان کے ایک بہت بڑے حصے پر قائم ہو گیا۔ بقول احتشام حسین:

> "سچ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی لٹیروں کی ایک تنظیم تھی جس نے اپنے ایک صدی کے مجرمانہ عہدِ اقتدار میں ملک کو اچھی طرح لوٹا۔ اگر بالواسطہ اس سے کچھ فائدہ بھی پہنچ گیا اور کسی طرح کے نئے شعور کا ظہور بھی ہوا تو اس کے تاریخی اسباب تھے۔ جن سے روگردان نہیں ہوا جا سکتا تھا۔" (۱)

انگریزوں کے لیے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی حکمت عملی بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اسی پالیسی کے تحت انھوں نے ہندوستان کے مختلف طبقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان، حب الوطنی، بھائی چارگی اور قوم پرستی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی موثر کوشش کی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں بسنے والے مختلف طبقے آپس میں برسرپیکار رہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کو گہن لگنے کے بعد

وہ روز بہ روز رو بہ زوال ہونے لگی۔ ملک کے مختلف صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہونے لگے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں انگریزوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور سرزمین ہند پر اپنے قدم مضبوطی سے جما دیئے۔

۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کی ناکامی کے کئی اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ ہندوستانیوں میں نہ تو کوئی تنظیم اور باقاعدگی تھی اور نہ ہی اس بغاوت کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطہ نظر سے، انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں عشرِ عشیر طاقت بھی نہیں تھی۔ اس طرح ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ ہندوستان کے سارے طبقات نے ملکر اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے انگریزوں کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا، اس لیے یہی طبقہ خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کا معتوب بنا۔ انگریزوں کو یہ احساس بھی تھا کہ انھوں نے حکومت بہر حال مسلمانوں سے چھین لی ہے اور اسی طبقے کو پوری طرح کچل کر وہ ہندوستان پر اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ سکتے ہیں۔ چناں چہ انگریزوں نے انتقامی کار، وائی کے طور پر مسلمانوں کو سرکاری ملازمت سے برطرف کیا۔ ان کی جاگیریں، مناسب اور وظیفے بند کر دیے۔ بے شمار لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، متعدد افراد کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی، لاتعداد اشخاص تختہ دار پر چڑھائے گئے اور لاکھوں گھر اجاڑے گئے۔ بقول سرسید احمد خان:

> "کوئی آفت ایسی نہیں تھی جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسماں پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ جو کتابیں اس ہنگامے کے بابت تصنیف ہوئیں ان میں بھی یہی کہا گیا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں،

اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔" (۲)

۱۸۵۷ء کے واقعات نے سرسید کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں عام طور پر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو جس تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیلات سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے والی اس قیامت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ بے گناہوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ ترک وطن پر آمادہ تھے لیکن قوم کے درد نے انھیں اپنے ہم وطنوں کو مصیبت میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں پناہ لینے سے روک دیا۔ سرسید اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لئے تادم آخر کوشاں رہے۔ مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مضامین اور کتابیں لکھیں یہاں تک کہ حکمرانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا لیکن اس کے صلے میں قوم کی طرف سے ان پر کفر کے فتوے لگے، قاتلانہ حملے ہوئے اور غداری کی تہمت لگی (۳)۔ لیکن اس کے باوجود سرسید نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی پامردی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور بالآخر ان کی یہ سعی و کاوش مخالفتوں کے باوجود کارگر ثابت ہوئی۔ بقول پروفیسر نورالحسن نقوی " وہ قوم جس کے جانبر ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے، سرسید کی کوشش سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئی۔ سرسید کی یہ کوشش سرسید تحریک کہلائی اور چوں کہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے بھی یاد کی گئی۔" (۴)

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں پائے جانے والے عیوب و نقائص کو دور کر کے انھیں فلاح و بہبود

کے راستے پر گامزن کرنا تھا۔ سرسید اس تحریک کی روح رواں تھے۔ وہ مسلمانوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی قوم کو فرسودہ روایات اور توہم پرستی کے رجحان سے منقطع ہونے، زندگی کے مادی مسائل سے دل چسپی لینے اور تجدّد و تحرک کے میدان کو اپنانے کا درس دیا۔ سرسید کا عہد مسلمانوں کی پستی اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس دور کے مسلمانوں میں دنیا بھر کی برائیاں، خرابیاں اور عیوب موجود تھے۔ ان میں بے عملی اور بے حسی تھی، جہالت تھی، سستی اور کاہلی تھی، تعصب تھا، خوشامد اور ظاہرداری تھی، ریاکاری اور چاپلوسی تھی، وہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور شرفا کے طرزِ گفتگو سے بھی بے بہرہ تھے۔ سرسید کی ان سارے مسائل پر نظر تھی۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں میں جہد و عمل کی نئی روح پھونکنے کا فقید المثال کارنامہ انجام دیا۔

سرسید نے انگریزوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ انگریز عہدہ داروں کے ساتھ انھوں نے چھوٹی بڑی متعدد خدمات پر کام کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انسانی ہمدردی کے تحت انھوں نے بعض انگریز عہدہ داروں اور ان کے اہل خاندان کی جانیں بچاتی تھیں۔ انگریزوں کے تہذیب تمدن، اخلاق و معاشرت اور علوم و فنون میں جو باتیں قابلِ تعریف تھیں سرسید انھیں بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد ہندوستان کے دانشوروں نے محسوس کیا کہ انگریز جیسی طاقت ور اور منظم قوم کا مقابلہ ہندوستانیوں کے لیے سردست ممکن نہیں۔ اول تو اس لیے کہ ہماری قوم نہایت پس ماندہ اور حد درجہ غیر منظم ہے۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطہ نظر سے، انگریزوں سے مقابلے کی طاقت بھی ہندوستانیوں میں نہیں تھی۔ اس لیے مصلحان قوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ مرحلے میں ہندوستانیوں کا انگریزوں سے مقابلہ کرنا، دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔ اس سے بہتر یہ ہے۔ عملاً ہندوستانی اور انگریز ایک قابل عمل سمجھوتہ پر پہنچ جائیں اور

ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو مغربی زبان و ادب اور علوم و فنون سے فیض پہنچانے کی غرض سے سرسید نے انگلستان کا سفر بھی کیا تھا۔ اس سفر کا مقصد ایک طرف مسلمانوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی منصوبہ پیش کرنا تھا جس کے سہارے مسلمانوں کی نئی نسل متمدن دنیا میں اپنا موثر حصہ ادا کر سکے اور دوسری طرف ایک ایسی یونیورسٹی کے خواب کو عملی جامہ پہنانا تھا جس میں مسلمان نوجوانوں کو مغربی زبان و ادب اور علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو مشرقی تہذیب یا اسلامی تمدن کی بنیادی خوبیاں بھی ان کی سیرت میں برقرار رہیں۔ سفر انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے مدرستہ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے نام سے ایک کالج قائم کیا تھا۔ پہلے یہ ادارہ صرف اسکول کی جماعتوں تک محدود تھا اور پھر بعد کو یہاں کالج کی سطح پر تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد اس کالج نے ایک مستقل یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی اور آج بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے

اردو زبان و ادب کو مغربی شعر و ادب سے فیضیاب کرنے کے سلسلہ میں علی گڑھ تحریک نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، وقار الملک، محسن الملک، محمد حسین آزاد، چراغ علی اس تحریک کے ممتاز اراکین تھے۔ بعد کو اس عظیم الشان تحریک سے وابستہ ہونے والے شعرا اور ادیبوں میں وحید الدین سلیم نواب عماد الملک، عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، آفتاب احمد خاں، مولوی عبدالحق، طفیل احمد، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم، عزیز مرزا عنایت اللہ، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں (۵)۔

سرسید تحریک کی نمایاں خصوصیات مندرجِ ذیل ہیں:

فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور غالب کے مکاتیب کی مقبولیت کے باوجود اردو نثر ابھی تک فارسی زبان سے غیر معمولی متاثر تھی۔ عام بول چال کی زبان تحریر میں استعمال نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر سرسید اور ان کے رفقاء نے عام بول چال کی زبان کو تحریر میں استعمال کرنے کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے خیال کو عام فہم لیکن موثر انداز میں پیش کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی اور زبان کی خوبیوں کو ثانوی۔ سرسید بنیادی طور پر ایک سماجی مصلح تھے۔ اس مقصد کی تبلیغ و تلقین کے لیے فطری طور پر انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اردو زبان کا استعمال کیا اور اس طرح اردو زبان بالواسطہ طریقے پر سرسید کی عظیم سماجی تحریک سے وابستہ ہو گئی۔ چوں کہ سرسید کا اسلوب پراثر تھا اس لیے نہ صرف ان کے ہم نوا بلکہ مخالفین بھی جو ان کی مخالفت میں اخبار اور رسالے نکالتے تھے، نادانستہ طور پر سرسید کی زبان اور ان کے اسلوب کی پیروی کرتے تھے۔ اس طرح سماجی انقلاب کی اس جدوجہد میں اردو نثر کا سادہ اور موثر اسلوب خود بخود اردو لکھنے والوں میں رواج پا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل درست لکھا ہے:

"سرسید اور انکی جماعت کے لوگوں نے اردو کو جو علمی اعتبار سے اس وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا۔" (۵)

متعدد اصناف ادب انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر اردو میں رائج ہوئے۔ سرسید نے انگریزی کے مشہور ادیبوں ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں مختلف سماجی، اخلاقی، علمی، دینی اور سیاسی مسائل پر خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقاء سے بھی لکھوائے۔ اس طرح مختصر

مضمون (Essay) اور انشائیے (Light Essay) کی صنف اردو میں رواج پانے لگی۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک طرف سائنٹفک انداز اور عقلیت پرستی پر زور دیا جاتا تھا اور دوسری طرف غیر ضروری لفاظی اور عبارت آرائی سے گریز کیا جاتا تھا۔ اسلوب کی سادگی اور تاثر کی فراوانی اس تحریک کی بنیادی خصوصیت تھی۔ غرض علی گڑھ تحریک ایک عظیم الشان اصلاحی، علمی اور ادبی تحریک تھی جس کے بڑے دور رس اور دیرپا نتائج سامنے آئے۔ بقول پروفیسر نور الحسن نقوی "ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے احسان سے گراں بار نہ ہو۔ اس تحریک نے بے عملوں کو جہد و عمل کا درس دیا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھلائی۔ بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنی ذات میں خوبیاں پیدا کرنے پر آمادہ کیا، مشرق کے پجاریوں کو مغرب کے کارناموں سے آشنا کیا۔ دنیا کو بے حقیقت جاننے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھلایا۔ اس عظیم الشان تحریک نے سوتوں کو جگایا اور مردوں میں جان ڈالی۔ مختصر یہ کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔" (۷)

حوالے و حواشی

(۱) پروفیسر احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ ص ۱۷۹۔

(۲) مرزا خلیل احمد بیگ "ادیب" (سہ ماہی)۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ نمبر ۱۹۹۳ء ص ۲۲۰۔

(۳) نور الحسن نقوی۔ علی گڑھ تحریک۔ ادیب (سہ ماہی) ۱۹۹۳ء ص ۲۲۱۔

(۴) ایضاً ص ۲۲۲۔

(۵) سید عبداللہ۔ سرسید احمد خاں اور انکے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ (اسلام آباد ایڈیشن) ص ۵۸۔

(۶) ایضاً۔ ص ۵۔

(۷) نور الحسن نقوی۔ علی گڑھ تحریک۔ ادیب (سہ ماہی) ۱۹۹۳ء ص ۲۳۱۔

o o o

انجمن پنجاب

انیسویں صدی کے نصف دوم کا زمانہ اردو شعر و ادب کے جدید دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر اس دور میں اردو شاعری، انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے متاثر ہوئی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اردو شعر و ادب کا سرمایہ بڑی حد تک فارسی ادب کے زیر اثر نشو و نما پاتا رہا اور ہماری شاعری کا بیشتر سرمایہ غزلوں پر مشتمل تھا --- یا پھر قصیدوں، مثنویوں، مرثیوں اور رباعیوں پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اردو میں نظم نگاری ناپید تھی۔ محمد قلی قطب شاہ سے نظیر اکبر آبادی تک متعدد شاعروں نے، مختلف موضوعات پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نظم نگاری کے میدان میں نظیر اکبر آبادی کا نام ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جدید علوم و فنون اور مغربی شعر و ادب سے اثر پذیری کے نتیجے میں، اردو میں نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سرسید تحریک کے علمبرداروں نے اردو شاعری کے دائرے کو وسیع کرنے اور اسے نئی جہات سے آشنا کرنے کے سلسلہ میں ایک ناقابلِ فراموش رول انجام دیا ہے۔ سرسید احمد خاں شاعری کے افادی پہلو سے بخوبی واقف تھے اور شاعری کو وہ قوم کی اصلاح کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے الطاف حسین حالی سے "مسدسِ مدوجزر الاسلام" جیسی شاہکار نظم لکھوائی۔ جو "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہے۔" اس نظم میں حالی نے قوم کے عروج و زوال کی داستان بڑے دلکش اور موثر انداز میں بیان کی ہے۔ مسدسِ حالی کے بارے میں سرسید کہا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ دنیا میں تو نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے تو میں جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں۔ یہ نظم حالی نے ۱۸۷۹ء میں لکھی تھی جب کہ وہ دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں مدرس

تھے ۔ لیکن اردو میں جدید اردو شاعری کی داغ بیل محمد حسین آزاد نے " مسدس حالی " کی تخلیق سے کوئی پانچ سال پہلے " انجمن پنجاب " لاہور میں ڈال چکے تھے ۔

جدید اردو شاعری کے آغاز اور نشوونما کے سلسلہ میں انجمن پنجاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ۔ اردو کے صاحبِ طرز ادیب اور باکمال شاعر محمد حسین آزاد ، انجمن پنجاب کی روحِ رواں تھے ۔ انہوں نے اس انجمن کے پلیٹ فارم کے ذریعے اہلِ علم حضرات کو جدید شاعری کی اہمیت اور افادیت سے آشنا کرنے کی کامیاب تحریک چلائی اور جدید طرز کے مشاعروں کی بنیاد رکھی ۔

آزاد محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے ۔ انھوں نے استادِ شاہ ، شیخ محمد ابراہیم ذوق سے شاعری کے رموز و آداب سیکھے تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد جب ان کے والد کو سزائے موت سنائی گئی تو آزاد نے دہلی سے ترک وطن کر کے لاہور میں پناہ لی ۔

دہلی کالج کا شیرازہ بکھرنے کے بعد یہ کالج لاہور منتقل ہوا اور گورنمنٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لاہور علم و ادب اور شعروسخن کی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا ۔ آزاد کے علاوہ دہلی سے لاہور پہنچنے والے ادیبوں اور شاعروں میں مولوی کریم الدین احمد ، پنڈت من پھول ، مولوی سید احمد دہلوی ، پیارے لعل آشوب درگا پرشاد نادر اور الطاف حسین حالی جیسے اہلِ علم شامل تھے ۔

انجمنِ پنجاب کے کے سرپرست اور محرک کرنل ہال رائیڈ تھے لیکن اس انجمن کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا لاہور گورنمنٹ کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائیٹز کے سرہے ۔ وہ ایک باصلاحیت اور اولوالعزم دانشور تھے ۔ بقول ڈاکٹر انور سدید " ڈاکٹر لائیٹز کو نہ صرف علومِ مشرقی کی بقا اور احیا سے دلچسپی تھی بلکہ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمت عملی کے مطابق انگریزی زبان کے ذریعے علوم سکھانے کا طریق عملی مشکلات سے دوچار تھا چناں

چہ انہوں نے اس خطے کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا عہد کر لیا اور انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کی داغ بیل ڈالی " (۱) ۔یہی انجمن بعد میں " انجمن پنجاب " کے نام سے مشہور ہوئی ۔ جس کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد تھے :

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیا

۲۔ صنعت و تجارت کا فروغ

۳۔ باشندگان ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت

۴۔ علمی و ادبی ، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بحث

۵۔ صوبے کے بارسوخ اہل علم طبقات اور افسران حکومت میں رابطہ

۶۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری (۲) ۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے نہ صرف یہ کہ مدرسے اور کتب خانوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی بلکہ مختلف سماجی ، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر بحث و مباحثے کے لیے جلسے منعقد کرنے کا بھی منصوبہ بنایا گیا۔ انجمن پنجاب کی آواز دور دور تک پہنچانے کی غرض سے رسائل جاری کرنے کا بیڑہ اٹھایا گیا۔ انجمن پنجاب کے ابتدائی جلسوں میں مضامین و مقالات پڑھنے والوں میں مولوی محمد حسین آزاد ، ڈاکٹر لائیٹز ، پنڈت من پھول ، پروفیسر علمدار حسین ، بابو چندر ناتھ بابو نو بین چندر رائے اور مولوی عزیز الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر اہل قلم کے مضامین رسالہ۔ انجمن پنجاب میں شائع ہوئے ۔ ان جلسوں میں چوں کہ محمد حسین آزاد کے مضامین سب سے زیادہ پسند کیے گئے ۔ اس لیے ڈاکٹر لائیٹز نے انجمن کے خرچے پر آزاد کو مستقل لکچرر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی ۔ لکچرر کی حیثیت سے آزاد کے تقرر کے استقلال کے بعد انھوں نے انجمن پنجاب کو ایک فعال اور کارکرد ادارے کی حیثیت دے دی ۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں :

" اس عہدے پر محمد حسین آزاد کی تعنیاتی نے انجمن پنجاب کی تحریک کو نئی توانائی دی ۔ انھوں نے اس حیثیت میں اتنی عمدہ خدمات سر انجام دیں کہ ڈاکٹر لائٹز آہستہ آہستہ انتظامی امور کے پس منظر میں اوجھل ہوتے گئے ۔ اور ادبی پیش منظر میں محمد حسین آزاد بتدریج نمایاں ہونے لگے ۔ آزاد نے ایک اختراع یہ کی کہ جلسہ، عام کے اختتام پر روایتی مشاعرے کا اضافہ کر دیا اور یوں انجمن پنجاب کے مقاصد کے فروغ کے لیے اس میں عوامی دل چسپی کا سامان بھی فراہم کر دیا ۔ " (۳)

انجمن پنجاب نے جہاں ایک طرف اپنے جلسوں میں پیش کیے جانے والے مقالات و مضامین پر بحث و تبصرے کے ذریعے اردو میں تنقید نگاری کے لیے فضا ہموار کر دی تو دوسری طرف نئی طرز کے مشاعروں کی طرح ڈال کر اردو میں نظم نگاری کی باضابطہ تحریک چلائی ۔ انجمن کے جلسوں میں " اردو کی نشو و نما اور اصلیت "، " شمس ولی اللہ " اور " شاہ حاتم " کے زیرِ عنوان آزاد کے مضامین مباحثے کے لیے پیش کیے گئے تھے ۔ یہ مضامین اردو میں جدید تنقید کی روایت کے نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین پر شرکائے محفل کو علمی و ادبی نکات پر اظہار رائے کا موقع دیا جاتا تھا ۔ اس طرح انجمن پنجاب ہی سے مجلسی تنقید کا بھی آغاز ہوا، جس کا تسلسل اور ارتقاء بیسویں صدی میں " حلقہ اربابِ ذوق " اور ترقی پسند تحریک کی ادبی محفلوں میں نظر آتا ہے ۔ انجمن پنجاب کا سب سے اہم کارنامہ اردو میں جدید طرز کے مشاعروں کی ترویج و اشاعت ہے ۔ ان مشاعروں میں آزاد کے دوش بدوش حالی نے بھی نہ صرف یہ کہ شاعروں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کی بلکہ خود بھی عملی طور پر مختلف موضوعات پر بڑی دل کش اور موثر نظمیں لکھیں ۔ حالی کو اس بات کا علم تھا کہ آزاد کے ذہن میں، ایک عرصے سے جدید طرز کی شاعری کو فروغ دینے کا خیال کارفرما تھا ۔ چناں چہ وہ

لکھتے ہیں:

"لاہور میں کرنیل ہال رائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی موضوع کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا تاکہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کر دیں، میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔" (۴)

ڈاکٹر انور سدید کے بیان کے مطابق۔ اردو شاعری کی اصلاح کا خیال آزاد کے ذہن میں اگست ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوا۔ لیکن اردو شاعری کی تحریک کا واضح تصور اس وقت سامنے آیا جب انھوں نے ۷/ مئی ۱۸۷۴ء کو نیچر کی شاعری پر ایک مدلل تقریر کی تھی اور اردو شاعری کی قباحتوں کو تفصیل سے آشکار کر دیا (۵)۔ آزاد نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

"اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنیٰ یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شئے سے خوف و خطر کسی شئے پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو

اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے ۔ بے شک مبالغے کا زور ، تشبیہہ و استعارے کا نمک ، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے ۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک نہ کہ تمام کھانا نمک ۔۔۔۔" (۶)

حالی اور آزاد نے محسوس کیا کہ زندگی کے بے شمار مظاہر اور مسائل ایسے ہیں جنھیں شاعری کا موضوع بنایا جاسکتا ہے ۔ ہماری شاعری کی قدیم روایات شاعروں کو نئی راہوں پر چلنے سے روکتی ہیں ۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں عموماً کوئی طرحی مصرع دیا جاتا تھا ۔ جس پر تمام شاعروں کو مخصوص قافیہ و ردیف اور بحر کی پابندی کرتے ہوئے غزلیں لکھنی ہوتیں ۔ اس کے برخلاف انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جانے لگا ۔ جس پر تمام شاعروں کو نظمیں کہنی ہوتی تھیں ۔ اس طرح انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو میں نظم گوئی کا آغاز ہوا ۔

آغا محمد باقر کی تحقیق کے مطابق انجمن پنجاب میں جدید طرز کے دس مشاعرے منعقد ہوئے ۔ مشاعروں کے آغاز سے پہلے ۹/ اپریل ۱۸۷۴ء کو ہونے والے جلسے میں آزاد نے نئی شاعری کے امکانات کے موضوع پر ایک عالمانہ مضمون پڑھا اور " شب قدر " کے عنوان سے اپنی ایک نظم بھی سنائی ۔ آزاد کا مضمون اور نظم بے حد پسند کی گئی چناں چہ جلسہ کے اختتام پر کرنل ہال رائڈ نے کہا کہ " اس وقت مولوی محمد حسین آزاد نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر جو اشعار سنائے وہ بہت قابل تعریف ہیں ۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ ہے اس طرز کا جس کا رواج مطلوب ہے ۔ " (۷) انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ ۳۰/ مئی ۱۸۷۴ء کو " برسات " کے موضوع پر منعقد ہوا ۔ دوسرا مشاعرہ ۳۰/ جون ۱۸۷۴ء کو ہوا جس کا موضوع " زمستان " تھا اس مناظمے میں شریک ہونے والے چند مشہور شعرا کے نام یہ ہیں ۔ محمد حسین آزاد ، انور حسین ہما ، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف دہلوی ، مولوی قادر بخش ، الہیٰ بخش رفیق ، اموجان ولی دہلوی شاگرد

غالب ، مولوی مقرب علی رئیس ، مولوی عطاء اللہ خاں عطا۔ اسی طرح دیگر آٹھ مشاعرے علی الترتیب " امید "، " حب وطن "، " امن "، " انصاف "، " مروت "، " قناعت "، " تہذیب " اور " اخلاق " کے زیرِ عنوان منعقد ہوئے۔ روز بروز شاعروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور مشاعروں کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔

اخبار و رسائل میں ان مشاعروں کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا اور انجمن پنجاب کی تقلید میں میرٹھ میں " نظم سوسائٹی " اور دہلی میں " دہلی لٹریری سوسائٹی " کے نام سے انجمنیں تشکیل دی گئیں۔ جہاں بالترتیب " امید کے موضوع پر سید محمد مرتضیٰ بیان اور مولوی سیف الحق ادیب نے " برسات " کے عنوان سے منظومات پیش کیں۔ یہ دونوں موضوعات انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ابتدائی موضوعات سے ماخوذ ہیں۔ بقول روشن اختر کاظمی:

> " آزاد کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کوششوں سے اردو شاعری کو حیاتِ نو بخشی اور وہ شاعری جو کہ فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھی جاتی تھی اس کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ آزاد نے شاعری کی اہمیت ، اس کی ترویج و ترقی ، اصلاح و ترمیم کی طرف بالغ نظر حضرات کو متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی " (۸)

آزاد کی نظموں کا مجموعہ (مجموعہ نظمِ آزاد) جدید اردو شاعری کے ابتدائی اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے ، جس میں موضوعات و مضامین کی رنگا رنگی اور تنوع بھی ہے اور شاعرانہ فن کاری کے سبب بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادیِ مشکیں نسب ہے تو

آمد کی تیری شان تو زیبِ رقم کروں
پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر
فرماں نشان میں بھی اڑے گا جہان پر
تا صبح ہووے کار گہہ روز گار بند
آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند (۹)

اس میں شک نہیں کہ انجمنِ پنجاب کی روحِ رواں محمد حسین آزاد تھے اور انھوں نے اپنی نظموں ، تحریروں اور تقریروں کے ذریعے جدید طرز کے مشاعروں کی حمایت میں غیر معمولی خدمات انجام دیں لیکن جدید شاعری کی تحریک کو مہمیز لگانے اور نئی نسل کو جدید اردو شاعری کی طرف راغب کرنے کا سہرا الطاف حسین حالی کے سر ہے ۔

حالی پانی پت کے ایک غریب اور قدامت پسند خاندان میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دہلی پہنچے ۔ نوجوانی کا زمانہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مرزا غالب کی صحبت میں گزرا ۔ ۱۸۵۷ء کے دل ہلادینے والے واقعات کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ وہ ایک صاحبِ فکر انسان اور درد مند دل کے مالک تھے ۔ سرسید احمد خان کی صحبت نے ان کے جوہر کو چھکایا ۔ ابتداً انھوں نے شیفتہ ، غالب اور مومن کے زیر اثر قدیم طرز کی غزلیں لکھیں ۔ بہ حیثیت غزل گو حالی کا مقام نہایت بلند ہے ۔ اگر وہ جدید اردو شاعری کے بانی نہ ہوتے تو ان کی غزلیں ہی اردو شاعری میں ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی تھیں ۔

انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری کو انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کروانے کا سہرا آزاد اور حالی دونوں کے سر ہے ۔ لیکن حالی نے عملاً شاعری کے

نئے نظریے کی مدلل اور عالمانہ انداز میں تشریح اور تلقین کی ۔ وہ ایک طرف انجمن پنجاب کے مقبول شاعر تھے تو دوسری طرف ان کا " مقدمہ شعر و شاعری " جدید اردو شاعری کے اعلان نامے (Menifesto) کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس تصنیف میں حالی نے شاعری کا نیا نظریہ پیش کیا ہے ۔ انھوں نے زبان کے مقابلے میں خیال کی اہمیت پر زور دیا ۔ لفظی اور معنوی صنعتوں کے مقابلے میں سادگی ، بیان کو ترجیح دی ۔ حالی کے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جس میں سادگی ، جوش اور اثر ہو ۔ بہ حیثیت شاعر حالی کا ایک یادگار کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی فرمائش پر ایک طویل نظم مسدس مدوجزر الاسلام لکھی ۔ حالی کی اس نظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان کے اجداد کے کارنامے یاد دلاکر ، ان میں نیا حوصلہ پیدا کرنے کا شاندار کارنامہ انجام دیا ۔ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین " حالی نے ہمارے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا جس میں ہم اپنے خدوخال دیکھ سکتے تھے اور جب لوگوں کو اپنی بگڑی ہوئی شکل نظر آئی تو بہت چراغ پا ہوئے مگر " مسدس حالی " کے آئینے پر گرد و غبار نہ آسکا وہ اسی طرح حالات کی عکاسی کرتا رہا ۔ شعرا دھیرے دھیرے نظم کی طرف بڑھنے لگے ، سیاسی شعور بڑھنے لگا ۔ مغربی ادبیات کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے ، جمہوریت کا احساس اور معاشی انصاف کا تقاضہ زور پکڑنے لگا ۔ " (۱۰) مسلمانوں کی عظمت رفتہ سے متعلق " مسدس حالی " کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے حالی کے کلام کی سادگی و پرکاری کا اندازہ ہوتا ہے :

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک
کہ نقش قدم ہیں نمودار اب تک
ہیں سیلون میں ان کے آثار اب تک
ہمالہ کو ہیں مواقعات ان کے ازبر
نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

نہیں اس طبق پر کوئی براعظم
نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب ، ہند ، مصر ، اندلس ، شام ، دیلم
بناؤں سے ان کی ہے معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
ملے گا جہاں جاؤ گے کھوج ان کا (۱۱)

حالی اور آزاد کی تحریک کے زیر اثر اردو میں نظم نگاری کا رجحان نشو و نما پانے لگا اور پھر آسمانِ شاعری پر یکے بعد دیگرے اسمٰعیل میرٹھی ، سرور جہان آبادی چکبست ، نظم طباطبائی ، عظمت اللہ خاں جیسے نظم نگار ، درخشاں ستاروں کی صورت میں نمودار ہونے لگے ۔ حالی اور آزاد کی اس تحریک کا نقطۂ عروج بیسویں صدی کے نصفِ اول میں کلامِ اقبال کی شکل میں سامنے آتا ہے ۔

حواشی

(۱) اردو ادب کی تحریکیں ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۸۵ء ۔ ص ۳۶۹

(۲) آغا محمد باقر ۔ مرحوم انجمن پنجاب "مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین ص ۱۲۲ ۔ ۱۲۴

(۳) ڈاکٹر انور سدید ۔ اردو ادب کی تحریکیں ۔ ص ۳۷۱ ۔ ۳۷۲

(۴) دیباچہ مسدسِ حالی ۔ ص ۱۱ ۔

(۵) ڈاکٹر انور سدید ۔ اردو ادب کی تحریکیں ۔ ص ۳۷۷

(۶) مقالات آزاد ۔ مرتبہ آغا محمد باقر ۔ ص ۲۲۹

(۷) برج موہن دتاتریہ کیفی ۔ منشورات ۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ ۔ ص ۲۲۵

(۸) ڈاکٹر روشن اختر کاظمی ۔ اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء ۔ ص ۱۴۵

(۹) محمد حسین آزاد ۔ نظم آزاد ۔ ص ۵۴

(۱۰) مجتبیٰ حسین ۔ تحریر و تقریر ۔ دور حاضر اور اردو غزل ۔ ص ۱۹۶

(۱۱) بحوالہ اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء ۔ ۱۹۸۴ء ۔ ص ۱۵۰

○ ○ ○

ڈاکٹر زور کی تقاریر و خطبات

انسان کو خدا نے ذہانت، تفکر، تدبر، شعور، ارادہ اور اختیار وغیرہ اوصاف سے متصف کر کے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔ انھیں اوصاف میں ایک امتیازی وصف قوت ناطقہ یا صلاحیت گفتار بھی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو حیوان ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ حیوانات و جمادات اور نباتات قوت گویائی سے محروم ہوتے ہیں۔ قدرت نے صرف انسانوں میں کلام کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ گفتگو اور بات چیت کے ذریعے ہم اپنے مافی الضمیر کا اظہار اور خیالات کی ترسیل کرتے ہیں۔ لیکن بہ اعتبارِ فن یہ کلام کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس کا اعلیٰ درجہ تقریر اور خطابت ہے جس کے ذریعے کوئی مقرر یا خطیب نہ صرف اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے زورِ بیان سے سامعین کے خیالات کو بدل دیتا ہے۔

تقریر و خطابت دراصل ایک فن ہے۔ ہر شخص اس فن میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص پیدائشی مقرر نہیں ہوتا البتہ مشق و مزاولت کے ذریعہ اس میں کمال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ ان کی صلاحیتِ کلام دیگر پیشوں سے وابستہ افراد کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ ہر استاد کسی نہ کسی درجے میں ایک مقرر ضرور ہوتا ہے اور ذرا سی کوشش سے وہ اچھا مقرر بھی بن سکتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں جب ہم ڈاکٹر زور کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کم و بیش تمام شاگردوں نے انھیں متفقہ طور پر ایک بہترین استاد مانا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ قدرت نے انھیں بولنے کی بہترین صلاحیت سے نوازا تھا۔ چوں کہ درس و تدریس کا پیشہ اچھی تقریر میں معاونت کرتا ہے اس لئے ڈاکٹر زور کو ہم ایک اچھا مقرر کہہ سکتے ہیں۔

عام طور پر فنِ تقریر کے تین لوازمات بتائے جاتے ہیں (۱) مختلف علوم کی زیادہ سے

زیادہ معلومات (۲) زبان و بیان پر عبور اور (۳) انداز بیان ۔ڈاکٹر زور میں فن تقریر کے یہ تینوں لوازمات بدرجہ اتم موجود تھے ۔ان کے مطالعہ کی وسعت اور تحقیق و تدقیق کی گہرائی محتاج بیان نہیں ہے ۔انھیں بیک وقت مختلف علوم و فنون میں تبحرانہ قدرت حاصل تھی ۔قدیم اردو ادب ۔تاریخ ۔تحقیق، تنقید، لسانیات، صوتیات غرض ادب کے مختلف شعبوں میں انھیں دست گاہ حاصل تھی ۔خصوصاً دکنی زبان و ادب اور دکن کی تاریخ و تہذیب کی وہ چلتی پھرتی انسائکلوپیڈیا تھے ۔

تقریر و خطابت کے فن میں انداز بیان اور لب و لہجہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ۔لب و لہجہ ہی مقرر کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے ۔انداز بیان اور لہجے میں آواز کا بڑا دخل ہوتا ہے ۔پست اور منحنی آواز تقریر و خطابت میں نہیں چل سکتی ۔مقرر یا خطیب کے لئے بھاری اور پاٹ دار آواز ضروری ہے ۔خوش قسمتی سے ڈاکٹر زور کو قدرت نے ایسی ہی آواز سے نوازا تھا۔ مولوی محمد اکبرالدین صدیقی کا بیان ہے کہ زور صاحب کی "آواز میں گھن گرج تھی، طنطنہ تھا، رعب تھا" (۱) ۔ظاہر ہے کہ اس گونجدار اور طنطنے والی آواز کے سہارے ڈاکٹر زور سامعین کو اپنی تقریر میں باندھ رکھنے کامیاب رہتے ہوں گے ۔آواز کے علاوہ مقرر کی ظاہری شخصیت، چہرہ بشرہ، پوشاک اور وضع قطع بھی سامعین پر اثر انداز ہوتی ہے ۔مقرر کی کامیابی اور تقریر کی اثر آفرینی میں ان باتوں کا گہرا دخل ہوتا ہے ۔ڈاکٹر زور کی شخصیت نہایت مرعوب کن اور سحر انگیز تھی دیکھنے والوں پر اس کا خاص اثر پڑتا تھا ۔پروفیسر سید مبارز الدین رفعت کے بہ قول "ان کے بارعب چہرے، ان کے ڈیل ڈول، ان کی پاٹ دار آواز اور ان کے بالوں کی مخصوص تراش یہ سب چیزیں میرے لئے بہت مرعوب کن رہیں وہ بیک وقت مجھے فلسفی، شاعر، عالم اور پروفیسر نظر آرہے تھے ۔اکثر حضرات میری ہی طرح پہلی ہی ملاقات میں ان سے متاثر اور مرعوب ہو جاتے تھے (۲) ۔ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں "ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی بارعب، متین اور پروقار تھی ۔اعلیٰ سماجی حیثیت اور سیاسی اقتدار رکھنے والے لوگ بھی ان سے برابر کی سطح پر ملتے اور ان کا احترام کرتے تھے ۔ان کے لہجے میں بڑی گونج اور ایک خاص طرح کی گرج تھی ۔جو شخص بھی ایک بار ان سے مل لیتا ۔وہ ان سے ضرور مرعوب ہو جاتا (۳) ۔

مقرر کے لئے خیالات کی آمد اور ذہن و فکر کی یکسوئی لازمی ہے اس کے بغیر کوئی شخص کامیاب مقرر نہیں بن سکتا۔ خیالات کی مسلسل آمد اور ذہن کی یکسوئی کی بدولت تقریر میں تسلسل اور روانی پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ مقرر وقفوں اور سکتوں کے درمیان ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔ خوش قسمتی سے زور صاحب کو مبداء فیاض نے ان دونوں خوبیوں سے سرفراز کیا تھا۔ یعنی علم کی فراوانی نے ان کے اندر خیالات کے لگاتار تسلسل اور ذہن کی یکسوئی نے ارتکازِ فکر کی کیفیت پیدا کی تھی جس کی وجہ سے ان کی تقریر بے ربطی اور موضوع سے انحراف کا شکار نہیں ہوتی تھی۔ ان کی افتاد طبع ہی کچھ ایسی تھی کہ ہجومِ مشاغل میں بھی وہ اپنے کام سے غافل نہیں ہوتے تھے۔ اسی طرح کام کے دوران کسی کی دخل اندازی کے سبب وہ انتشارِ ذہنی میں مبتلا نہیں ہوتے تھے چنانچہ ان کے شاگردِ رشید محمد اکبرالدین صدیقی لکھتے ہیں:

"باتیں ہو رہی ہیں۔ سامنے کچھ کتابیں اور مخطوطے کھلے ہیں۔ بازو پانوں کا پیاکٹ دھرا ہے ایک پان نکالتے ہیں کھاتے ہیں۔ قلم بھی چلتا ہے منہ بھی چلتا ہے۔ زبان بھی چلتی ہے۔ لوگوں سے بھی باتیں ہوتی ہیں اور ٹیلی فون پر بھی اور تذکرۂ اردو مخطوطات جیسی اہم کتاب لکھی جاتی ہے ان سب پر مستزاد دفتر کی مثلوں اور کردی کھاتوں پر بھی دستخطوں کا کام جاری ہے" (۴)

زور صاحب کی ہمہ رخی اور کثیر الجہت مصروفیات کے واقعات ان کے متعدد احباب اور تلامذہ نے بیان کئے ہیں۔ جن سے ان کی مضبوط قوت ارادی، بے پناہ ذہنی توانائی اور فعال قوتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک کامیاب مقرر کو ان تمام اوصاف سے متصف ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر زور کی بیک وقت ہمہ رخی معروفیت اور ذہنی ارتکاز کے سلسلہ میں ان کے ایک اور شاگرد احمد جلیس لکھتے ہیں:

"۱۹۵۸ء میں چادر گھاٹ کالج کے رسالے "فکر نو" کے لئے انہوں نے ایک مضمون دینے کا وعدہ کیا اور شرط یہ رکھی کہ میں لکھتا جاؤں وہ بولتے جائیں گے۔ ابھی انہوں نے چند سطریں لکھوائی ہوں گی کہ چپراسی دفتری کاغذات اور فائلیں لے آیا۔ زور صاحب دستخط کرنے

سے پہلے فائلوں پر بھی نظر ڈالتے جاتے اور مضمون بھی لکھواتے رہے
اسی طرح درمیان میں طلبہ اور ان کے دیگر احباب ملتے رہے جس
سے مضمون کا تسلسل کئی کئی بار ٹوٹا لیکن زور صاحب اطمینان سے
اسی طرح لکھواتے رہے ۔ حوالے اور سنین انھیں ایسے ازبر تھے کہ
کسی کتاب کی مدد کے بغیر انہوں نے تاریخی مثنوی "قصہ طالب موہنی
پر ایک جامع مضمون لکھوادیا" (۵) ۔

اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلامتی فکر اور یکسوئی فکر کے ساتھ ساتھ زور صاحب زبردست قوت حافظہ کے مالک تھے جو مقرر کے بنیادی شرائط میں سے ایک ہے ۔ قوی اور موثر حافظہ کے بغیر کوئی شخص اچھا مقرر نہیں بن سکتا ۔ قوت حافظہ در اصل قسام ازل کا گراں بہا عطیہ ہے ۔ خصوصاً مقرر کے لیے یہ ہزاروں قوتوں کی ایک قوت اور ہزاروں صفتوں کی ایک صفت ہے ۔ معلومات اور خیالات کے ایندھن کے بغیر تقریر کی گاڑی آگے نہیں بڑھتی ۔ زور صاحب کی توانا یادداشت اور بالیدہ قوتِ حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے حامد صدیقی لکھتے ہیں ۔ "ڈاکٹر صاحب کا حافظہ بھی ایسا غضب کا ہے کہ تیس بتیس برس کی باتیں پورے حاشیے اور بین السطور کے ساتھ آپ کو یاد ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ فطری خاموشی اور سوچ بچار کی قوت کے غلبہ کے باوجود جب آپ کسی محفل میں کھل کر حکایات اور روایات بیان کرنے لگتے ہیں تو بس ساری محفل پر چھاجاتے ہیں" (۶) ۔

مقرر کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ سامعین کے معیار اور ان کی نفسیات کے مطابق تقریر کرے ۔ زور صاحب کا یہ وصف تھا کہ وہ مخاطب کے ذوق اور موقعہ و محل کی مناسبت سے بات کرتے تھے جناب حامد صدیقی رقم طراز ہیں " ہر قسم کے آدمی کے سامنے اس کے رنگ کی بات فرماتے ۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ عربی داں حضرات کی موجودگی میں آپ بر محل برجستہ عربی کے دوچار شعر اور عربی کے دوچار ضرب الامثال اور علماء کے سامنے موقع کی دوچار آیتیں نہ پڑھتے ہوں ؟ فارسی کے بے نظیر اشعار آپ کی مٹھی میں بند ہیں جب فارسی داں حضرات بیٹھے ہوں تو بات بات میں چٹکیاں لیتے ہیں اور آسماں کے اشعار زمیں پر بیٹھ کر سنادیتے ہیں" (۷) ۔

تقریر کی بہترین صلاحیت رکھنے کے باوجود ڈاکٹر زور ان مقررین میں سے نہیں تھے جنھیں تقریر کا شوق ہوتا ہے اور جو بڑے آدمیوں کے سامنے تقریر کرنے کا کوئی موقع گنوانا نہیں چاہتے ۔ زور صاحب میں سرکردہ شخصیتوں کے آگے خود کو نمایاں کرنے کی کمزوری نہیں تھی ۔ ایسے موقعوں پر تقریر سے گریز ہی کرتے تھے ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے ہم جماعت محمد اکبر وفاقانی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ یوم کلیہ جامعہ عثمانیہ کے موقع پر ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیادت علی خاں کی نگرانی میں طلبہ نے ایک ڈرامہ پیش کیا جسے دیکھنے کے لئے ولی عہد بہادر نواب اعظم جاہ تشریف لائے تھے ۔ پرنسپل مولوی عبدالرحمن خاں نے زور صاحب سے تقریر کرنے کو کہا اور کوئی ہوتا تو اس اعزاز کے حصول کے لیے آگے بڑھتا لیکن ڈاکٹر زور نے انکار کر دیا ۔ اور اکبر وفاقانی کو جو اس ڈرامے کے ہدایت کار بھی تھے تقریر کے لیے آگے بڑھا دیا ۔ زور صاحب حتی المقدور تقریر سے گریز کیا کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اچھا مقرر نہیں گردانتے تھے لیکن جب اصرار کیا جاتا تو تقریر کرتے اور ایسی کرتے کہ لوگ ان کی معلومات اور خبر ونظر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں ۔ " زور صاحب خود کہتے ہیں کہ اچھے مقرر نہیں ۔ لیکن جب بھی بولنے پر مجبور کیا گیا ان کے پاس خیالات کا ذخیرہ نکلا " (۸) ۔

ڈاکٹر زور ادب کے عالم اور ادبی تاریخ و لسانیات کے بے نظیر ماہر تھے ۔ وہ ادب کے کسی بھی موضوع پر عالمانہ اظہار خیال کر سکتے تھے ۔ ان کی تقریر اس قدر مدلل اور دل نشین ہوتی تھی کہ سننے والا ان کی بات مان لیتا تھا (۹) ۔ مقرر کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ سامعین کو اپنا قائل اور ہم نوا بنالے ۔ زور صاحب اپنی شخصیت کی مقناطیسی کشش ، گونجدار آواز اور علمیت کے زور سے سامعین پر چھا جاتے تھے ۔

زور صاحب کی تقاریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی جوشیلے لیڈر کی جذباتی تقریریں یا کسی پیشہ ور خطیب کی شعلہ بیانیاں نہیں ہیں بلکہ ایک سلیم الطبع ، صاحب علم اور سلجھے ہوئے ذہن و فکر کے حامل دانشور کے ارشادات ہیں جو معلومات افزا بھی ہیں اور خیال افروز بھی ۔ ان تقریروں سے جذبات کو اشتعال نہیں ملتا البتہ یہ کسی موضوع پر سنجیدگی سے سوچنے اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کا حوصلہ اور

ترغیب ضرور دیتی ہیں۔

زور صاحب کی شخصیت مکر، ریا، حیل و حجت اور احساس کمتری جیسے عیوب سے یکسر مبرا تھی۔ انہوں نے کہیں بھی روباہی یا مصلحت کیشی سے کام نہیں لیا۔ ان کے اسی رویے کا اظہار ان کی تقریروں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے دیرینہ معاون جناب وقار خلیل اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> "انھوں نے (ڈاکٹر زور نے) اظہار خیال میں کبھی تکلف اور تامل سے کام نہیں لیا۔ دل میں جو آتا وہ کہہ گزرتے........ کوئی لاگ لپٹ ان کے پاس نہیں، صاف دلی اور صاف گوئی ان کا شعار رہا" (۱۰)۔

زرو صاحب تقاریر میں اردو کی وکالت نہایت بے لاگ اور بڑے دو ٹوک انداز میں کرتے تھے انھیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کی تقریر سے بھلے ہی کچھ جبینوں پر شکنیں پڑجائیں یا کچھ چہروں پر برہمی کے آثار نمایاں ہوں۔ وہ اپنے اصولی موقف میں مفاہمت کو دخل اندازی کا موقع دینے کے روادار نہ تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے رفیق کار پروفیسر محمود حسین لکھتے ہیں:

> "ایک مرتبہ جنوبی ہند کی کسی اہم کانفرنس میں شرکت کی۔ ایک اجلاس کی صدارت پنڈت نہرو نے کی تھی۔ اس میں بڑا زور دار خطبہ پڑھا اور اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی طرف حکومت ہند کی توجہ منعطف کرائی" (۱۱)۔

دنیا کے بڑے بڑے خطیبوں اور مقرروں کے حالات شاہد ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی پیدائشی مقرر نہیں تھا۔ سب مشق و مزاولت اور سعی و ریاضت کی بدولت فن خطابت کے درجہ کمال کو پہنچے۔ زور صاحب بھی ابتداء میں کوئی فسوں طراز مقرر نہیں تھے لیکن تقریر و خطابت کی مداومت نے انھیں اس فن میں طاق کر دیا تھا۔ بالخصوص ادارہ ادبیات کی تقاریب اور اردو زبان کی ترقی کے لیے منعقدہ جلسوں میں ان کی طبیعت کا انشراح اور فکر کا انبساط خوش گفتاری اور جادو بیانی کے عجب گل کھلاتا تھا۔ مولوی محمد اکبرالدین صدیقی فن تقریر میں ڈاکٹر زور کے بتدریج اکتساب

کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شروع میں ڈاکٹر صاحب کچھ اچھے مقرر نہ تھے لیکن ان کی شہرت، ان کے کام اور ان کی مقبولیت نے بہت ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انھیں کہیں جلسوں کی صدارت۔ یونینوں کے افتتاح اور مشاعروں کی میری کے لیے بلاتے۔ صرف مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی ڈاکٹر صاحب کسی کی درخواست کو شاذ ہی رد کرتے اس کا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ اچھے مقرر بن گئے" (۱۲)۔

حیدرآباد میں زور صاحب کو نہایت وقیع و رفیع سماجی مرتبہ حاصل تھا۔ وہ حیدرآباد کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں کے روح رواں تھے۔ جلسے جلوس۔ مشاعرے۔ عرس۔ سماجی تقریبیں۔ دعوتیں ملاقاتیں۔ انجمنیں۔ کمیٹیاں۔ غرض بے شمار تنظیموں اور اداروں کی سرگرمیوں میں وہ شریک رہتے۔ اور ان محفلوں کو اپنے حسن صدارت کے علاوہ بصیرت افروز خطبۂ صدارت سے چار چاند لگا دیتے تھے۔ ذیل میں ان کے بعض صدارتی خطبات کے حوالے سے ان کے خطبات کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ڈاکٹر زور عملی انسان تھے۔ وہ محض زبانی جمع خرچ کے عادی نہیں تھے بلکہ گفتار کے ساتھ ساتھ کردار کے بھی غازی تھے اور چاہتے تھے کہ اردو والے اردو کی زبانی ہمدردی کے دعووں اور نوحہ خوانی کی عادت ترک کر کے اس زبان کے فروغ اور ارتقا کے لیے عمل کے میدان میں آگے آئیں اور عملی طور پر کچھ کر دکھائیں۔ ۱۴/ اپریل ۱۹۴۴ء کو جبل پور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس میں شعبہ اردو کے صدارتی خطاب میں انھوں نے اہل اردو کو اردو زبان کے تحفظ اور استحکام کے لیے تعلیم بالغان کی راہ عمل سجھائی۔ اس کے ذریعے ان کے خیال میں دوہرے فوائد کا حصول ممکن تھا۔ ایک تو یہ کہ اردو زبان کی اشاعت ہوگی دوسرے یہ کہ ملک میں تعلیم اور خواندگی کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ تعلیم بالغان کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

"ایسے وقت میں سچے اور مخلص ہمدردان اردو کا اصل کام تو یہ ہے کہ ان لاکھوں اردو بولنے والوں کو صحیح معنوں میں اردو داں بنانے

کی کوشش کریں جو ارباب اردو کی غفلت و نادانی اور دوسروں کی دانائی کی بنا پر بہت جلد اردو دنیا سے علاحدہ ہو جائیں گے کیوں کہ تقریباً ہر صوبہ میں ایسے لاکھوں غریب اور پریشان حال موجود ہیں جو پڑھنے لکھنے کی دولت سے محروم ہیں اگر اہل اردو چاہتے ہیں کہ ان کی زبان بولنے والوں کی تعداد میں مستقبل قریب میں معتد بہ کمی نہ ہونے پائے تو ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کریں...... تعلیم بالغان کی مہم بجائے خود جو اہمیت رکھتی ہے اس کی نسبت تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کام سے ہم دوگونہ فوائد حاصل کریں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس طرح تعلیم کو عام کر کے ہم جہالت کی ان گھنگور گھٹاؤں کو دور کر سکیں گے جو ہمارے ملک پر چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں اور جن کی تاریکی میں ہمارے کروڑوں بھائی بھلے اور برے اور سچ اور جھوٹ کے مابین امتیاز نہیں کر سکتے اور اسی لیے وہ آسانی سے ایسے غلط بیانات باور کر سکتے ہیں کہ اردو قرآن شریف کی زبان ہے اور اس کو مسلمان حملہ آور اپنی تلوار کے ساتھ باہر سے ہندوستان میں لے آئے ہیں۔

تعلیم بالغان کا دوسرا فائدہ پہلے فائدہ سے بھی زیادہ اہم ہے اس لیے کہ ہماری اس مہم کے ساتھ ساتھ خود اردو کی بھی اشاعت ہوتی جائے گی۔ ہمیں یہ اچھی طرح ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری زبان کی بقا اور اشاعت کے سلسلہ میں فی الوقت تعلیم بالغان کو جو اہمیت حاصل ہے اتنی کسی اور مسئلہ کو حاصل نہیں۔ ان پڑھ لوگوں کو اس وقت جس زبان میں بھی پڑھنا لکھنا سکھا دیا جائے گا ان کی اولاد بھی وہی زبان اختیار کرے گی۔ خاص کر صوبہ متحدہ اور صوبہ متوسط اور ان کے اطراف و اکناف کے اکثر علاقوں کے باشندے ایسی زبان یا بولیاں بولتے ہیں جو محض رسم الخط سیکھنے کے

بعد یا تو اردو بن جاتی ہیں یا ہندی ۔ اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ کوشش ان ہی مقامات پر تعلیم بالغان کے سلسلہ میں ہونی ضروری ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ہی علاقوں میں اردو کی تعلیم بالغان سے غفلت برتی جا رہی ہے اور ہمدردی اردو کے سارے مظاہرے محض نمود و نمائش اور مجلس آرائی کی حد تک آکر ختم ہو جاتے ہیں ۔ جو لوگ اردو کی محبت کے دعوے دار ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ اپنی تمدنی اور سماجی بہبودی کے بھی خواہش مند ہیں انھیں چاہیے کہ اپنے اپنے قریوں محلوں، گلیوں اور بازاروں میں تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کھولیں اور متحدہ طور پر سعی کریں کہ ان کے گاؤں یا محلے یا گلی میں کوئی شخص ایسا نہ رہے جس کو اردو پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو" (۱۳) ۔

زور صاحب کے خطبات میں ایک خاص منطقی ربط و تسلسل کا احساس ہوتا ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے موضوع کے بارے میں وہ پوری شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں ۔ وہ ایک ماہر انشاپرداز کی طرح بات میں سے بات نکالتے ہیں اور اپنے خطاب کو موضوع بحث کے مختلف اطراف و جوانب سے ہم کنار کرتے ہوئے اس میں فکر و خیال کے نئے جزیروں کی تخلیق کرتے ہیں ۔ ان کے خطاب میں پہاڑی ندی کا زور و شور اور تیزی نہیں ہوتی بلکہ کسی میدانی دریا کی سبک خرامی اور سیرابی کی کیفیت پائی جاتی ہے ۔ اپنے خطبات میں وہ زیر بحث موضوع کی تمام جزئیات کو نہایت سلیقے کے ساتھ بتدریج سررشتہ اظہار سے مربوط کرتے ہوئے چلتے ہیں ۔

زور صاحب اردو کو اس کے تاریخی تناظر اور لسانی پس منظر میں پورے ہندوستان کی زبان تصور کرتے تھے ۔ وہ اس سلسلہ میں دبستانوں کی تفریق ۔ علاقائی عصبیت اور اہل اردو کے تفاخر کو قطعی روا نہیں رکھتے تھے ۔ ان کے نزدیک اردو ایک ترقی پسند زبان ہے جسے کسی علاقے اور شہر کے حلقے میں محصور نہیں کیا جا سکتا وہ کہتے ہیں کہ اردوے معلیٰ اور علاقائی برتری کے گھمنڈ کا دور ختم ہو چکا اب جدید رجحانات، عوام کی روزمرہ زبان اور ذہنی میلان کو پیش نظر رکھ کر ایک عظیم تر اردو

کی داغ بیل ڈالنے کی ضرورت ہے۔ انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل کی بزم ادب کی جانب سے فروری ۱۹۴۵ء میں منعقدہ جلسے کے خطبہ صدارت میں کہتے ہیں:

"اردو صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند زبان ہے وہ کسی خاص حلقے اور دائرے میں مقید نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے اس کا مستقبل بھی ان ہی لوگوں کے ہاتھوں بہتر بن سکتا ہے جو فرقہ وار اور صوبہ وار تعصبات کو پس پشت ڈال کر کشادہ دلی اور وسعت نظر سے اس کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں..... اب اردوے معلیٰ کا دور گزر گیا۔ گزرا ہوا زمانہ محض یاد باقی رکھنے اور افسوس کرنے سے واپس نہیں آسکتا اب عمل کی ضرورت ہے۔ ایسے ترقی پسندانہ عمل کی جو رفتار زمانہ کے قدم بہ قدم ہو اور جس کے لیے ایسے کارپرداز مہیا ہوں جن میں خار دار گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں سے بغیر الجھے آگے نکل جانے کی صلاحیت ہو۔ خدا کرے کہ آپ کی بزم ادب ایسے باہمت اور چونچال نوجوان پیدا کرسکے اور خدا کرے کہ ان کا نام اس عظیم ترار دو کے طرح اندازوں کی پہلی صفوں میں شامل ہو سکے" (۱۴)۔

ڈاکٹر زور وسیع المشرب، روشن خیال اور رواداری انسان تھے۔ مذہبی، لسانی، صوبائی کسی قسم کا تعصب انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں ہندو، سکھ پارسی وغیرہ مختلف مذاہب کے ماننے والے شامل تھے۔ اسی طرح ان کے تعلقات تلگو، کنڑا، مرہٹی وغیرہ سبھی زبانیں بولنے والوں اور ان زبانوں کے اساتذہ سے نہایت مستحکم و پرخلوص تھے۔ انھیں اردو زبان سے عشق ضرور تھا لیکن نفرت کسی زبان سے نہیں تھی۔ ہندی اور اردو کی رقابت سے کون واقف نہیں لیکن زور صاحب ہندی کی ترقی سے حسد کرنے والوں میں نہیں تھے۔ وہ ہر طرح کی قنوطیت اور احساس کمتری سے اونچا اٹھ کر پورے اعتماد کے ساتھ ہندی کے فروغ کی کاوشوں کو خوش آمدید کہتے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں ہندی کی اشاعت اردو کے فروغ کی زینہ بن سکتی ہے۔ انھیں اردو کی طاقت اور توانائی پر یقین کامل تھا کہ یہ زبان اپنے نازک اور دل نشین اسلوب کی بدولت ہندی کو متاثر کرے گی اور اس کے وسیلے سے ملک گیر مقبولیت

حاصل کرے گی۔

ہندی کے علاوہ تلگو اور دیگر علاقائی زبانوں کے تعلق سے بھی زور صاحب ایسے ہی کشادہ ذہن و قلب تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک سے زیادہ زبانوں سے واقفیت، ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ۱۹۶۲ء کے یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے زور صاحب نے اردو والوں پر زور دیا کہ وہ بلا تحفظ ذہنی ہندی، تلگو اور دوسری علاقائی زبانیں سیکھیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "اردو والوں کو اپنے ملک کی سرکاری زبان ہندی یا اپنے ہم سایوں کی زبان مرہٹی یا گجراتی یا تلنگی کے سیکھنے میں کبھی پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔ جب ہم نے ایک غیر ملکی زبان انگریزی سیکھی تو پھر اپنی ملکی زبان ہندی کے سیکھنے اور اس میں حشق و مزاولت پیدا کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ جب اردو بولنے والے ہندی سیکھ کر اس کے رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیں گے تو رفتہ رفتہ اردو کا اسلوب بیان ہندی پر بھی چھا جائے گا اور اس کو پڑھ کر ہندی والے محسوس کریں گے کہ اردو میں جو شائستگی روانی اور لوچ ہے اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے خود ہم بھی اردو رسم الخط سیکھیں اور اس طرح مہاتما گاندھی کا وہ منصوبہ پورا ہوگا جس میں انہوں نے ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی قرار دیا تھا اور اس کو ہندی اور اردو دونوں رسم الخطوں میں رائج ہونے پر زور دیا تھا" (۱۵)۔

ڈاکٹر زور ایک صاف گو اور کھرے انسان تھے۔ ان کے خطبات سے بھی ان کے اس وصف کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ بے جھجک اور بلا خوف لومت لائم اپنا موقف بیان کرنے کے عادی تھے جس بات کو وہ قابل تحسین سمجھتے تھے اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی اور تعریف کرتے اور جو بات ان کی نظر میں غلط ہوتی بہ بانگ دہل اسے غلط کہتے۔ اس معاملے میں کسی قسم کی مصالحت اور روباہی کا مظاہرہ نہ کرتے چنانچہ

جب حیدرآباد میں ترقی پسندوں کی تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی تو انہوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں نہ صرف اس تحریک کی خوبیوں کی ستائش کی بلکہ خامیوں کی بھی گرفت کی۔ وہ کہتے ہیں:

"ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شائد آئندہ بھی پہنچے کہ اس تحریک کے بعض علم بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ترقی پسندی اور انسانیت میں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی پامالیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلے میں کسی خاص سیاسی عقیدے کی تبلیغ کرنا ایک طرح کی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت کی علم برداری کی بجائے اگر انسانیت کی علم برداری کا دعویٰ کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے بہت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں گے اور ان کے بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے اور جس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے گا یہ ہے ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر کامیابی کا لازمی ذریعہ ہے اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں۔ بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی مترادف نہ بن جائیں لیکن یقین ہے کہ یہ اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہوگا کیوں کہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور شاعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جائیں گے ہمارا ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتی طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال کے ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک

ترقی پسند تحریک کا ہر دل دادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا وہ اس تحریک کے لیے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے گا اور اس کے ذاتی اعمال واقوال دوسروں کو اس مفید تحریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے" (۱۶)۔

زور صاحب کے خطبات میں زمانے کی شکایات اور نامساعد حالات کا گلہ نہیں ملتا۔ان میں کسی فرد یا ادارے کے خلاف منفی انداز کا رویہ بھی نہیں ملتا۔وہ مثبت انداز فکر کے مالک تھے یہی مزاج ان کے خطبات کا بھی ہے۔وہ ایک مدبر اور تجربہ کار رہنما کی طرح مثبت اور تعمیری انداز میں میدان عمل میں قدم رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔وہ ناسازگار ماحول، ناموافق حالات اور مایوس کن اندیشوں میں بھی امید و رجا کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔وہ محبان اردو میں یقین و اعتماد اور عزم و استقلال پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اس لیے ان کے خطبات میں پر امید اور خوش آئند مستقبل کا اشارہ ملتا ہے۔ڈاکٹر زور الفاظ کے تو تا مینا بنانے کے قائل نہیں تھے وہ عملی آدمی تھے خطبات میں بھی وہ نوجوانوں، طالب علموں اور اردو والوں کو اپنی زبان و ادب کے تحفظ اور فروغ کے لیے سعی پیہم اور جہد مسلسل کی دعوت دیتے ہیں۔ان کی دعوت میں مبارزت طلبی کی گھن گرج نہیں بلکہ پند پیر کا سا سچ، نرم اور دل نشین انداز پایا جاتا ہے۔

زور صاحب کے خطبات کی زبان سلیس و رواں اور اسلوب سادہ و دل کش ہے۔اس میں کہیں کوئی ابہام یا اشکال نہیں پایا جاتا۔زبان و بیان کی سادگی کے باوجود ان کا طرز استدلال نہایت چست اور پر اثر ہے۔اپنی بات کی تائید میں وہ فارسی اور اردو کے اشعار و محاورات اور ضرب الامثال کا نہایت موثر و برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ان سب باتوں پر مستزاد اردو کے تئیں ان کے اخلاص اور اس کے لیے ٹھوس خدمات ہیں جن کی بدولت ان کی تقاریر اور خطبات میں ایک خاص قسم کی تاثیر و توانائی زیریں لہروں کی طرح موج مارتی دکھائی دیتی ہے۔

حواشی:

(۱) محمد اکبر الدین صدیقی۔ ڈاکٹر زور صاحب۔ مشمولہ سب رس حیدرآباد (زور نمبر) ۱۹۶۳ء ص ۴۰۔

(۲) ایضاً ص ۶۵۔ (۳) ایضاً ص ۸۶۔ (۴) ایضاً ص ۴۵۔ (۵) ایضاً ص ۱۳۳۔ (۶) محمد بن عمر ڈاکٹر زور۔ ص ۱۲۸۔

(۷) ایضاً ص ۱۲۹۔ (۸) ایضاً ص ۱۰۷۔

(۹) وقار خلیل۔ ڈاکٹر زور کی شخصیت۔ مشمولہ (زور نمبر) سب رس ۱۹۶۳ء حیدرآباد۔ ص ۱۵۰۔

(۱۰) ایضاً ۱۵۲۔

(۱۱) پروفیسر محمود حسین۔ ڈاکٹر زور مرحوم۔ مشمولہ سب رس حیدرآباد۔ ۱۹۶۳ء (زور نمبر) ص ۳۸۔

(۱۲) محمد اکبر الدین صدیقی۔ ڈاکٹر زور صاحب۔ زور نمبر ۱۹۶۳ء۔ ص ۴۷۔

(۱۳) بہ حوالہ سب رس۔ زور نمبر۔ حیدرآباد۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۰۲۔ ۲۰۳

(۱۴) ایضاً۔ ص ۳۱۲۔ (۱۵) ایضاً۔ ص ۳۰۹۔ (۱۶) ایضاً۔ ص ۳۱۶۔

○ ○ ○

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مکتوب نگار

مکتوب دراصل دو آدمیوں کے درمیان تحریری گفتگو کا نام ہے، جس میں صاحب تحریر کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جھلک اٹھتی ہے۔ ایک اچھا خط غزل کی طرح اختصار و جامعیت، سادگی و بے ساختہ پن، جذبہ و احساس کی لطافت اور سچائی و خلوص کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کبھی یہ محض استفسار کے جواب میں لکھا جاتا ہے۔ کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے، کبھی اپنے دکھ اور شادمانی میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اور کبھی اپنی ان آرزوؤں اور خوابوں کے اظہار کے لیے تحریر کیا جاتا ہے جو شرمندہ تعبیر ہونے کے لیے مچلتے رہتے ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کے مکاتیب اس لیے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ یہ نہ صرف ادبی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ مکتوب نگار کے نہاں خانہ دل تک پہنچنے میں بھی ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اہل قلم فن کاروں کے خطوط کا بالاستیعاب مطالعہ محققین کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری کا تعلق ہے۔ انھوں نے اپنے دوست، احباب، تلامذہ اور عزیزوں کو سینکڑوں خطوط لکھے ہیں لیکن تا حال ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا، البتہ بعض رسائل و مجلات میں ان کے چیدہ چیدہ خطوط شائع ہوئے ہیں پیش نظر مضمون میں انھیں خطوط کے حوالے سے زور صاحب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے نیز یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ان خطوط میں ان کی شخصیت کے کون کون سے گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر زور ایک بے باک اور بے لاگ انسان تھے۔ ان کی بارعب شخصیت نے کبھی مکر و ریا اور مصلحت کوشی جیسی پرفریب نقابوں کا سہارا نہیں لیا۔ وہ اپنے احباب و معاصرین اور شاگردوں و ماتحتین سے بلا تصنع اور بلا تکلف بات کرتے تھے

اور ہر ایک سے کھل کر ملتے تھے۔ان کی شخصیت کا یہ انداز ان کے خطوط میں بھی روشن نظر آتا ہے۔ان کے مکاتیب سادگی اور صاف گوئی کا نمونہ ہیں۔ان کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بناوٹ اور آورد کا احساس نہیں ہوتا۔ان خطوط میں وہ بے محابا اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔خوشی و مسرت، رنج و غم، فکر و تردد اور غصہ و خفگی ہر قسم کے جذبات وہ بے دھڑک ظاہر کر دیتے تھے۔بہ قول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ زور صاحب کے خطوط دراصل ایک ادیب کے نجی لمحات کی تصویریں ہیں، باتیں ہیں عام زندگی کی، دکھ سکھ کی، کاروبار شوق کی اور سفر و حضر کی۔الفاظ کی چولیں بٹھانے یا نگینہ کاری کرنے کی انھیں نہ تو فرصت تھی اور نہ وہ اس کے قائل تھے بے تکلف باتیں کرتے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔جو صاف گوئی، سادگی، بے باکی اور دلآویزی ان کی شخصیت میں تھی۔وہ ان خطوط میں بھی ملے گی۔"(۱)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کے خطوط ان کی نجی زندگی کے مختلف واقعات، علمی و تحقیقی مصروفیات، تصنیفی و تالیفی منصوبوں، ادارۂ ادبیات اردو کی تعمیر و ترقی کے مختلف مرحلوں اور اسی قبیل کی دیگر ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی مستند دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان مکاتیب کی داخلی شہادتوں سے زور صاحب کی سیرت و شخصیت کے پنہاں زاویے، افتادِ طبع اور ذہنی کشمکش کے پہلو بہ پہلو ان کے ذہنی اتار چڑھاؤ اور نفسیاتی کیفیات بھی سامنے آتی ہیں۔ان خطوط کے آئینے میں ہم زور صاحب کے اندر کے آدمی کو واضح اور بے حجاب دیکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے زمانہ طالب علمی ہی سے مکاتیب و مراسلت کی روایت اختیار کی تھی۔ان کے خطوط کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یورپ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے مکتوب نگاری کا جو انداز و اسلوب اختیار کیا تھا تادمِ مرگ وہ اسی نہج پر قائم رہے۔اسلوب کی یہ یکسانیت ان کی مستقل مزاجی اور وضع داری کی غمازی کرتی ہے ان کے مخاطبین میں ہر سطح اور ہر مرتبہ کے لوگ شامل ہیں۔لیکن زور صاحب کی تحریر ہر ایک کے ساتھ خلوص و محبت کی شمیم جاں فزا کی یکساں عطر بیزی کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے یورپ کے زمانے قیام کے دوران (۱۹۲۷ء۔ ۱۹۳۰ء) اپنے ایک

عزیز دوست نواب عبدالرحمن شریف کو متعدد خطوط لکھے جن کے مطالعہ سے ان کے زمانہ طالب علمی کے مختلف گوشے روشنی میں آتے ہیں۔ یہ خطوط ان کی ذہنی و فکری نشو و نما کے ایک خاص عہد اور ان کی شخصیت کی تعمیر و تربیت کے ایک خاص زمانی و مکانی پس منظر کی غمازی کرتے ہیں۔ ان مکاتیب کے ذریعہ زور صاحب کے نہ صرف افکار و تخیلات اور محسوسات و مشاہدات کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ ایک طالب علم کی جستجو اور مستقبل کے بارے میں اس کے تصورات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ نواب مذکور کے نام ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کے ایک خط میں لندن کے موسم سرما اور وہاں کی برف باری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"لندن کی آب و ہوا بڑی خراب ہے۔ میں اس سے بیزار آگیا ہوں۔ گزشتہ دو ہفتوں میں خاصی برف گری۔ یہ چیز میرے لیے نئی ہے اور ساتھ ہی پر لطف بھی۔ خصوصاً علی الصبح مطلع ابر آلود ہو تو برف ڈھکے مکان، درخت اور سڑکیں بقعہ نور نظر آتی ہیں۔" (۲)

یورپ کے علمی تحقیقی ماحول میں رہتے ہوئے ڈاکٹر زور کے سوچنے سمجھنے کے انداز اور ذہنی و فکری رویوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں وہ رقم طراز ہیں:

"نواب صاحب ہندوستان سے یہاں آنے کے بعد اس وقت تک جو جو خیالات پیدا ہوئے اور جو جو تبدیلیاں ہوئیں۔ ان کا اظہار کرنا چاہوں تو ایک کتاب بن جائے گی۔ بعض دفعہ تو جی چاہتا ہے کہ آپ لوگوں میں آجاؤں اور اپنے دل کے وہ تمام ارمان نکالوں جو حیدرآباد اور اپنے دوستوں کی بہبودی کے متعلق دل میں اکثر (جھلک) دکھاتے ہیں۔" (۳)

انسان کی باطنی تبدیلیوں کا اثر اس کے اظہار سے پیدا و ہویدا ہوتا ہے۔ خیالات و افکار کی تبدیلی رہن سہن اور طرز معاشرت میں بھی تغیر و انقلاب کی متقاضی ہوتی ہے۔ قیام یورپ کے زیر اثر نہ صرف زور صاحب کی ذہنی دنیا منقلب ہو گئی بلکہ ان کی بود و باش اور رکھ رکھاؤ میں بھی زبردست تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ میں یہاں وہ آدمی نہیں رہا ہوں جو کبھی تھا۔ میرا لباس بدل گیا۔ میری صورت بدل گئی۔ میرا کھانا بدل گیا۔ میرا طریقہ بود و باش بدل گیا۔ یہاں تک کہ میری زبان بدل گئی۔ کہیئے پھر میرے خیالات تبدیل نہ ہوئے ہوں۔" (۴)

اہل یورپ کے تجارتی نقطہ نظر اور ہر معاملے میں علمی اور عقلی پہلو کو ملحوظ رکھنے کے عام ماحول اور اپنی ذات پر اس کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو مرقومہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک میری علمی زندگی کا تعلق ہے میرا قیام یورپ زیادہ بہتر ہے یورپ انسان کو زیادہ عقلی بنا دیتا ہے۔ اس کی ہر چیز کاروباری نقطہ نظر سے سرزد ہوتی ہے۔ خصوصاً پیرس کے دو مہینے کے قیام نے میرے خیالات کی رو کو ایک ایسی طرف پلٹا دیا جس کا رخ شاید ہی تبدیل ہوسکے۔ کاش میرے سارے دن یہیں بسر ہوتے۔" (۵)

ڈاکٹر زور کو لندن کے مقابلے میں شہر پیرس زیادہ پسند آیا۔ اس کی وجوہات ان کے خطوط کے درج ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ان اقتباسات سے نہ صرف پیرس کی تعریف و توصیف نمایاں ہوتی ہے بلکہ زور صاحب کی مصروفیات اور دل چسپیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ۲۶/ ڈسمبر ۱۹۲۹ء کے ایک مکتوب میں انھوں نے لکھا ہے:

"یہاں طرح طرح کے انسانوں سے ملاقات ہوتی ہے لندن میں یہ موقع نصیب نہیں۔ جو کوئی یورپ آتا ہے۔ وہ پیرس ضرور آتا ہے اور اس طرح یہ شہر ہر وقت نئے نئے لوگوں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ جہاں کی دل چسپیاں شاید ہی دنیا میں کہیں اور نصیب ہوں۔" (۶)

۱۳/ فروری ۱۹۳۰ء کے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"نواب صاحب فرانس خاص طور پر پیرس، انسان کو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں پر اپنی مرضی سے نظریں ڈالنا اور نقطہ نظر قائم کرنا سکھاتا ہے میں واقعی بدبخت ہوتا اگر یہاں نہ آتا۔ ممکن ہے یہاں کا قیام میری زندگی کا بہترین زمانہ ثابت ہو۔" (۷)

یورپ کے زمانہ قیام کے دوران ڈاکٹر زور کے شب و روز کڑی محنت اور انتہائی مصروفیت و مشغولیت میں گزرتے تھے ۔ تعلیمی و تحقیقی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی انھوں نے منقطع ہونے نہیں دیا تھا ۔ اس دوران لکھے ہوئے خطوط میں اکثر وہ اپنی عدیم الفرصتی اور بے پناہ مصروفیت کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں آج کل بے حد مشغول ہوں ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے تھیسس کے علاوہ جرمن (زبان) کے درس بھی لے رہا ہوں ۔ سنسکرت اور لسانیات کے لیے بھی خاص تیاری کر کے کلاس میں جانا پڑتا ہے ۔ کاش میری زندگی کبھی تو چین سے بسر ہوتی آپ کو معلوم ہے کہ مڈل کے زمانے سے لے کر اب تک مسلسل مصروف ہوں ۔" (۸)

۲۴/ جنوری ۱۹۲۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ زمانہ میرے لیے بڑی مشغولیت کا ہے ۔ ارادہ ہے کہ جون میں اپنے کام پیش کر دوں ۔ لیکن ابھی ختم کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے ۔ آپ جانتے ہیں میں (بیک وقت) اپنے ضمنی کام کرتا رہتا ہوں ۔ ہندوستان میں جب تک رہا B.A. اور M.A. کے امتحانوں کے درمیان مضمون نگاری کرتا یہاں سنسکرت اور فلالوجی کی جماعتوں میں شرکت کے علاوہ بہت سے قیمتی قلمی کتابوں کی نقل کرنا اور ان پر نوٹ لینا جاری رہا ۔ اگر اس سال پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری مل جائے تو ارادہ ہے کہ اور دو سال رہ کر ڈی ۔ لٹ یا اور کوئی ڈگری کے لیے کام کروں ۔" (۹)

ڈاکٹر زور کے ان مکاتیب کی داخلی شہادتوں کی مدد سے ہم یورپ میں ان کے دور طالب علمی کی اکتسابی و تحقیقی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں اور یورپی ممالک کی سیر و سیاحت کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل کر سکتے ہیں ۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد ڈاکٹر زور کے عزیز ترین شاگرد و مددگار اور

رفیق کار تھے ۔ تقسیم ملک کے کچھ عرصہ بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے ۔ ڈاکٹر زور سے ان کی محبت اور قربت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں بھی انہوں "ادارہ ادبیات اردو" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور "سب رس" ہی کے نام سے ایک علمی، ادبی اور تحقیقی رسالہ جاری کیا جو ہر ماہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ۔ پروفیسر شاہد کے نام زور صاحب نے متعدد خطوط لکھے ہیں جن میں ان کی نجی اور مجلسی زندگی کے بے شمار پہلو محفوظ ہوگئے ہیں ۔ ان خطوط میں انہوں نے کہیں اپنی مصروفیات کا ذکر کیا ہے تو کہیں اپنی بیگم کی علالت پر تشویش و تردد کا اظہار کیا ہے ۔ کہیں اپنی لڑکیوں کے تعلیم و تربیت اور ان کی نسبت کی بات کی ہے تو کسی میں ادارے کے کاموں اور سب رس کی اشاعت کے بارے میں گفتگو کی ہے ۔ دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کی کیفیت سے باخبر کیا ہے اور شاہد صاحب کے احوال و کوائف کے بارے میں استفسار کیا ہے ۔ خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں کہ " ان خطوط کے مطالعہ سے آج سے ۲۵ ۔ ۳۰ سال قبل کے استاد شاگرد کے روحانی رشتوں سے آگاہی آج کے استادوں اور شاگردوں کے لیے ایک روشن مینار ثابت ہوگی اور آپ محسوس کریں گے کہ شرافت مجسم اور احترام انسانیت کا ایک قابل تقلید نمونہ تھے ۔" (۱۰) ذیل میں ان خطوط سے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

" اب کام کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں ۔ چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کام نہیں چھوڑتے یکے بعد دیگرے سلسلہ بندھا ہوا ہے ۔ اب یوم محمد قلی قطب شاہ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں ۔ گھریلو معاملات پیچھے پڑ جاتے ہیں ۔ ادارے کے کام بڑھتے جا رہے ہیں " (۱۱)

" آپ کی یاد ہر وقت اور ہر موقع پر آتی ہے ۔ عجیب بات ہے کہ جن کو قریب رکھنے کی کوشش کی وہی دور ہو گئے ۔ آپ کا بھی وہی ہوا اور تہذیب (۱۲) کا بھی حالاں کہ اس کے لیے باہر کے کتنے عمدہ عمدہ پیام آئے تھے ۔ اس خیال سے نہیں دیا کہ قربت رہے ۔ مگر فطرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ شادی کے بعد ہی خود مجھے وہاں سے نکل جانا پڑا ۔ اس سے پتہ چلا کہ قسمت میں عزیزوں سے فراق اور دوری ہے اور اس

وجہ سے ایک خاص سوز و کرب دل میں پیدا ہوتا ہے۔" (۱۳)

" میں بے حد مصروف اور بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں ------ ہر وقت ان کی قربت نہ ہونے سے بے چینی رہتی ہے ------ اب تکلیف کم ہے۔ مگر جب تک حسب معمول چلنے پھرنے نہ لگیں پریشان رہوں گا۔" (۱۴)

" تسنیم آر کی لکچرار اور توفیق بی۔اے میں شریک ہو رہی ہیں ------ تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔ بڑی فکر ہے۔ خدا کرے کہ جلدی کسی اچھے گھر میں طے پا یا جائے۔ لکچراری کا بھی کچھ نہ ہوا۔" (۱۵) (یہ سب زور صاحب کی صاحبزادیاں ہیں)

" آپ کی علالت کی خبر سے بڑی تشویش ہے۔ خدا کرے کہ اب تک صحت ہو گی ہو۔ ٹائیفائڈ کے بعد بڑی کمزوری ہو جاتی ہے۔ احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔" (۱۶)

" آج شام یہاں نمائش گراونڈ پر میری صدارت میں یوم اقبال منایا جارہا ہے۔ ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ افتتاح کر رہے ہیں۔ کل شام دوست محمد علاء الدین صاحب کی لڑکی کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ ابھی فیاض الدین صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ حسن ثانی نظامی کو ادارہ دکھانے لا رہے ہیں۔ کر پلانی صاحب بھی آ رہے ہیں۔ گوپال ریڈی کل ایک روز کے لیے آئے تھے۔" (۱۷)

زور صاحب کو دکن کے طبقۂ نسوان کی بیداری اور ان کی علمی و تعلیمی ترقی کا بھی خیال تھا۔ علم و تحقیق کی میدان میں خواتین کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کے مقصد سے انہوں نے ادارہ ادبیات اردو میں ایک شعبہ نسوان بھی قائم کیا تھا محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ اس شعبہ کی معتمد تھیں۔ ڈاکٹر زور سے ان کے خاندانی مراسم بھی تھے۔ اس

ترین نظم و نثر میں اضافہ ہوگا" (۲۰)۔
علمی و تحقیقی کاموں کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے عہد کی مختلف علمی شخصیتوں سے مراسلت کی اور مختلف موضوعات و مسائل میں ان کے علم و تجربات سے استفادہ کیا۔ انھیں میں سے ایک نواب مشرف جنگ فیاض کے فرزند محمد کریم الدین خاں مرحوم (تحصیل دار ورنگل) بھی تھے (۲۱)۔ نواب صاحب کا قیمتی و نایاب کتب خانہ انھیں کے تصرف میں تھا۔ زور صاحب نے اس کتب خانے کے مخزونہ قلمی و مطبوعہ نسخوں سے کریم الدین خاں مرحوم کے توسط سے استفادہ کیا تھا۔ خان مرحوم کے نام ان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ تحقیق میں مطلوبہ مواد کی فراہمی میں وہ کیسی کھکھیڑ اٹھایا کرتے تھے:

"میں آج کل حضرت فیض علیہ الرحمتہ پر کام کر رہا ہوں۔ ان کے کلام کا انتخاب کر لیا ہے جو فیض سخن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ان کے حالات زندگی اور دیگر تصانیف سے متعلق آپ سے بھی مواد حاصل کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ نواب عزیز یار جنگ نے فرمایا ہے کہ ان کی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تحریریں آپ کے یہاں ہوں گی "شرح فیض" اور ایک آدھ کتاب میں نے خود آپ کے یہاں دیکھی تھی۔ بہرحال جو کچھ ہو چند روز کے لیے میرے یہاں بذریعہ ٹپہ روانہ فرمائیں یا نواب عزیز یار جنگ کے یہاں روانہ کریں تو ان سے مجھے مل جائے گا" (۲۲)

انھیں خان مرحوم کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کے یہاں بعض دکنی کے قدیم دیوان بھی تھے۔ ان پر مضمون لکھنے کی ضرورت ہے اگر آپ ان کو چند روز کے لیے نواب عزیز یار جنگ کے توسط سے روانہ فرمائیں تو یوم ولی کے سلسلہ میں جو نمائش سٹی کالج میں ہو رہی ہے اس میں بھی پیش کریں اور آپ اجازت دیں تو مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے" (۲۳)۔

ڈاکٹر زور کی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم سے بھی مراسلت رہی ہے۔ ان

حضرات کے نام مکاتیب میں اکثر ان کے تحقیقی کاموں کی مدح و ستائش کے علاوہ ان کی ملازمت و ترقی سے متعلق نیک خواہشات کا تذکرہ ملتا ہے تاکہ انھیں کام کرنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ ملے۔ نارنگ صاحب کے خطوط میں انھوں نے ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لیے مرکزی و ریاستی حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے سے متعلق سلسلہ جنبانی کو آگے بڑھانے کی خواہش کی ہے:

"منسٹری آف کلچرل افیرس معلوم کر لیجیے کہ انسائیکلوپیڈیا کی گذشتہ سال کی امداد اور سال رواں کی جدید امداد ابھی تک نہیں ملی کام رکا پڑا ہے۔ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی امداد بھی جاری نہیں ہوئی۔ جلد کچھ کر لیجیے ورنہ بے موت مرجائے گا اور آپ کو مرثیہ لکھنا پڑے گا۔ (۲۴)

"آپ کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ میرے پاس آیا تھا۔ اس کو پڑھ کر آپ کی لیاقت محنت اور عزت میری نگاہ میں بڑھ گئی۔ بڑی خوشی ہوئی آپ نے بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ فوراً شائع کر دی جائے اور اس اہم کام پر آپ کو انعام بھی ملے۔" (۲۵)

"خوشی ہوئی کہ آپ نے یاد فرمایا۔ نارنگ صاحب کی ریڈری سے بھی خوشی ہوئی اسلم پرویز صاحب کا کیا ہوا۔ اب ان کی فکر ہے۔ آپ کی پی ایچ۔ ڈی کا بھی خیال رہتا ہے۔" (۲۶)

"آپ کے کالج میں اردو کا پوسٹ قائم ہو جائے گا۔ آپ کے پرنسپل صاحب سے موثر میں گفتگو رہی خدا کرے کہ آپ نہ صرف مستقل ہو جائیں بلکہ مسلسل ترقی کرتے رہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی جلد تکمیل

کر لیجیے ۔ یہ ڈگری مزید ترقیوں میں ممد و معاون ثابت ہوگی ۔" (۲۷)
اردو زبان میں مکتوب نگاری کے ابوالآبا مرزا غالب نے لکھا ہے " میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے ۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کرو ۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو ۔" ڈاکٹر زور بھی غالب کی اس طرز سے متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ ان کے بعض مکاتیب میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مراسلے میں مکالے اور تحریر میں گفتگو کا انداز پیدا ہو گیا ہے ۔ مثلاً پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد کے نام درج ذیل مکاتیب میں ان کی گفتگو کا انداز قابل داد ہے:

" عزیز مکرم آپ کا خط بڑے انتظار کے بعد ملا ۔ جلد جلد لکھتے رہیئے ۔ طبعیت بہت پست ہو گئی ہے ۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے ۔ عمارت کی تکمیل کا انتظار ہے ۔ بڑی دیر لگ رہی ہے ۔" (۲۸)

"یہاں بارش شروع ہو گئی ہے ۔ مطلع ابر آلود ہے ۔ پھوار جاری ہے اس کو کہتے ہیں عالم آرائی ہر طرف سبزہ ہے اور موسم خوش گوار ہے مگر اب دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جارہی ہے ۔ علمی وادبی کاموں سے بھی اگلی سی لگن باقی نہیں رہی ۔" (۲۵)

" پرسوں حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر مرکزی حکومت ادارہ دیکھنے آئے تھے ۔ زین یار جنگ نے خیر مقدمی تقریر کی ۔ محرم کی وجہ سے محفل شعر و سخن نہیں ہوئی ۔ خشک سی صحبت رہی مگر حافظ صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہاں نادر کام ہو رہا ہے ۔ ی مگر یہ سب باتیں آپ کو لکھنے سے کیا فائدہ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے جنت کو یا عالم بالا کو خط لکھ رہا ہوں ۔۔۔۔۔ بچے کیسے ہیں ۔ ان کی اچھی پرداخت کیجیے لاڈ پیار کا وقت گزر چکا ۔ معظم صاحب کیسے ہیں ۔ سب کو اور خسر صاحب کو سلام کہیے ۔" (۳۰)

جو رسائل و جرائد آتے ہیں ۔ ان میں آپ کا نام ڈھونڈتا

ہوں ۔ کہیں نظر نہیں آتا ۔ بڑی مایوسی ہوتی ہے ۔ میں انتہا سے زیادہ ہی مصروف ہوں پہلے میں کام ڈھونڈتا تھا اب کام مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آرہے ہیں ۔" (۳۱)

ڈاکٹر زور کے مکاتیب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس نے لکھا ہے ۔" زور صاحب کی مکتوب نگاری کا خاص وصف یہ ہے کہ انہوں نے یہ خطوط قلم برداشتہ لکھے ہیں اور ان میں پوری صاف گوئی اور بے باکی سے اپنے جذبات و خیالات اور مختلف واقعات پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے ۔ ان خطوط میں تعلقات کی شیرینی اور خلوص کا مہک پائی جاتی ہے ۔ انہوں نے اپنے خطوط سے نیاز فتح پوری مجنوں گورکھپوری کی طرح تنقید نگاری اور ابوالکلام آزاد کی طرح انشا پردازی کا کام نہیں لیا ۔ ان کے خطوط نجی علائق و روابط کی تفسیر اور ذاتی و خانگی معاملات کی تصویر ہیں ۔ لیکن اس بے تکلفی اور بے نیازی کے باوجود ان کے خطوط ادبی محاسن، نزاکتوں اور ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں اہم داخلی شہادتوں سے مملو ہیں ۔" (۳۲)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زور کے مکاتیب میں ان کی علمی و ادبی مصروفیات، درس و تدریسی مشغولیات، تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو ان کی شخصی اور نجی زندگی کے متعدد گوشے روشن نظر آتے ہیں ۔ ان خطوط کے مطالعہ کے بغیر زور صاحب کی سیرت و شخصیت اور ان کے مختلف الجہات علمی و ادبی اور تحقیقی و تنقیدی کارناموں کا واضح اور مکمل خاکہ سامنے نہیں آتا اس لیے ان مکاتیب کی ایک خاص تحقیقی اہمیت ہے ۔ دنیائے علم و ادب میں زور صاحب ایک بلند پایہ محقق، صاحب بصیرت نقاد، باکمال افسانہ نگار، خوش گو شاعر، بے مثال سوانح نگار اور ماہر دکنیات و لسانیات کی حیثیت سے روشناس خلق ہیں لیکن خطوط کے آئینے میں وہ ایک طرف ہمدرد انسان، مونس و غم گسار شوہر اور مشفق و مہربان پدر کے روپ میں جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف دکنی زبان و ادب کے ایک بے لوث خدمت گزار، بزرگ رہنما، شفیق استاد مخلص دوست اور اردو تحریک کے ایک فعال نمائندے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر زور کے چند خطوط مشمولہ "شیرازہ" کشمیر۔ مئی ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۵۴۔

(۲) سید رفیع الدین قادری۔ ڈاکٹر زور لندن میں۔ مشمولہ سب رس۔ حیدرآباد نومبر ۱۹۸۰ء ص ۲۶۔

(۳) ایضاً

(۴۔۵۔۶) بہ حوالہ سب رس۔ حیدرآباد۔ نومبر ۱۹۸۰ء۔ ص ۲۸۔۲۹۔

(۷۔۸۔۹) ایضاً۔ ص ۳۱۔

(۱۰) بہ حوالہ سب رس (کراچی) ستمبر ۱۹۸۰ء۔ ص ۵۔

(۱۱) خطوط ڈاکٹر زور مرحوم مشمولہ سب رس۔ کراچی۔ (زور نمبر) جنوری ۱۹۷۹ء۔ ص ۲۳۵

(۱۲) ڈاکٹر زور کی صاحب زادی

(۱۳) ایضاً۔ ص ۲۲۷۔

(۱۴) ایضاً۔ ص ۲۲۴۔

(۱۵) ایضاً۔ ص ۲۲۳۔

(۱۶) ایضاً۔ ص ۲۲۴۔

(۱۷) بہ حوالہ سب رس (کراچی) بابتہ ستمبر ۱۹۸۰ء۔

(۱۸) بہ حوالہ سب رس (حیدرآباد) بابتہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۶ء۔ ص ۶۵۔

(۱۹) ایضاً۔ ص ۷۱۔۷۲۔

(۲۰) خطوط زور مرحوم۔ سب رس (کراچی) ۱۹۷۹ء۔ ص ۲۳۲۔

(۲۱) مشرف جنگ فیاض مشہور مصنف محمد نورالدین خاں کے تایا تھے

(۲۲) بہ حوالہ سب رس۔ حیدرآباد۔ بابتہ جنوری ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۶۔

(۲۳) ایضاً۔ ص ۳۷۔۳۸۔

(۲۴) خطوط زور مرحوم مشمولہ سب رس (زور نمبر) کراچی ۱۹۷۹ء۔ ص ۲۳۵۔۲۳۶۔

(۲۵) ایضاً۔ ۲۳۴۔

(۲۶) بہ حوالہ سب رس حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۸۶ء۔ ص ۳۷۔۳۸۔۔

(۲۷) سب رس زور نمبر کراچی ۱۹۷۹ء۔ ص ۲۳۴۔ (۲۸۔۲۹۔۳۰) ایضاً۔ ص ۲۳۳۔

(۳۱) ایضاً۔ ص ۲۳۵۔ (۳۲) سب رس حیدرآباد۔ نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۱۰۔

ادبی تاریخ نویسی کی روایت اور ڈاکٹر زور

ڈاکٹر زور نقاد، ماہر لسانیات، ماہر دکنیات، افسانہ نگار، شاعر، سوانح نویس مرتب، مدون، معلم، ادبی مورخ سبھی کچھ تھے۔ بلاشبہ وہ اردو کے بہت بڑے محسن اور خدمت گذار تھے۔ جہاں تک ان کی ادبی تاریخ نگاری کا تعلق ہے، اس میدان میں بھی انھوں نے تحقیقی ژرف نگاہی اور وسعت مطالعہ کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ تاریخ ادب کے موضوع پر ان کی پہلی کتاب ۱۹۲۹ء میں "اردو شہ پارے" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ ادب پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر ان کی تصانیف سے قبل لکھی جانے والی تواریخ ادب پر بھی سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

ادبی تاریخ کے اولین نقوش تذکروں میں ملتے ہیں۔ قدیم تذکرے، لاکھ خامیوں کے باوجود مختلف شاعروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کام کی باتوں اور ضروری معلومات سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر گیان چند "قدیم تذکروں میں حالات کی وہ تفصیل نہیں جو بعد کے تذکروں اور تواریخ ادب میں ہے لیکن اپنی تمام کمزوریوں اور فروگذاشتوں کے باوجود ہم قدیم تذکروں سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ حال ماضی سے انقطاع نہیں کر سکتا وہ ماضی پر قائم ہے۔ اردو کے محققوں کے لیے خشت اول بلکہ حبل المتین یہی تذکرے ہیں جنھیں چشم کم سے نہیں دیکھنا چاہیے (۱)۔ میر تقی میر کے تذکرے "نکات الشعرا" (۱۱۶۵ھ) اور حمید اورنگ آبادی کے "گلشن گفتار" (۱۱۶۵ھ) سے احمد علی خاں شوق کے "تذکرہ کاملان رام پور" (۱۹۲۹ء) تک متعدد تذکرے سپرد قرطاس کیے گئے لیکن تذکرہ نگاروں سے ادبی تاریخ نویسی کی توقع نہیں کی جا سکتی اور تذکروں میں زیادہ تر شاعروں کے حالات اور خصوصیات کلام کے بارے میں اچٹتے ہوئے اشارے ملتے ہیں۔ ادبی تاریخ کی تعریف میں وہی کتاب آئے گی

جس میں شاعروں اور نثرنگاروں دونوں کو جگہ دی جائے۔تذکروں کے بعد تواریخ ادب ہی زبان وادب کے تدریجی ارتقاء اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔تذکروں اور تواریخ ادب کے فرق و امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"تذکرے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیے جاتے تھے تواریخ ادب تاریخی اعتبار سے ہیں۔ان میں ادوار کی تقسیم ہوتی ہے۔تاریخ ادب صرف افراد کی تاریخ نہیں ہوتی بلکہ اصناف ادب اور ادبی رجحانات کا ارتقا بھی پیش کرتی ہے۔جدید تاریخیں ادب کا مطالعہ اس کے سماجی پس منظر میں کرتی ہیں یہ بالکل فطری ہے کہ ابتدائی تاریخیں ہماری جملہ توقعات پوری نہیں کرتیں جس طرح بعد کے تذکرے ابتدائی تذکروں کے مقابلے میں بالیدہ ہیں اسی طرح تواریخ ادب نے ابتدا سے انتہا تک ترقی کی منزلیں سر کی ہیں" (۲)۔

اردو میں ادبی تاریخ نگاری کا نقطہ آغاز مشہور مستشرق گارساں دتاسی کی تالیف "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" کو کہا جا سکتا ہے۔اس کتاب کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں، دوسری ۱۸۴۷ء میں اور تیسری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی (۳)۔اس میں اردو اور ہندی دونوں شعرا کا تذکرہ شامل ہے۔چوں کہ دتاسی نے یہ کتاب ہندوستان سے دور پیرس میں بیٹھ کر لکھی تھی اس لیے اس میں اغلاط کا پایا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" کو حواشی کے ساتھ مرتب کر کے ایک فرانسیسی ریسرچ اسکالر لیلین نازرو نے ۱۹۶۱ء میں کراچی یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے محمد حسین آزاد کی مشہور زمانہ کتب آب حیات، (۱۸۸۱ء) شائع ہو چکی تھی۔اس کتاب میں تذکروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرف شاعروں سے سروکار رکھا گیا ہے۔آزاد بنیادی طور پر شاعر اور انشاپرداز تھے اور بہ قول شبلی وہ اگر گپیں بھی ہانک دیں تو لوگ اسے وحی سمجھتے تھے۔اس کتاب میں خاکہ نگاری کے اولین نمونے اور اپنے عہد کی بولتی ہوئی تصویریں تو ضرور نظر آتی ہیں

لیکن ادبی تاریخ نگاری اور آدابِ تحقیق کے تقاضوں پر یہ کتاب پوری نہیں اترتی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں لکھی جانے والی تاریخ ادب سے متعلق کتابوں میں حکیم عبدالحیٔ کی "گلِ رعنا" (۱۹۲۱ء)، نصیرالدین ہاشمی کی "دکن میں اردو (۱۹۲۳ء)، حکیم شمس اللہ قادری کی "اردوئے قدیم" (۱۹۲۵ء)، رام بابو سکسینہ کی "تاریخِ ادب اردو" (۱۹۲۷ء) اور محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" (۱۹۲۸ء) کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

"گلِ رعنا" کے مصنف عبدالحیٔ نے "آبِ حیات" کی طرح اپنی کتاب میں بھی صرف شاعروں سے سروکار رکھا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی مذکور ہوا ہے کہ ادبی تاریخ شعرا اور نثار دونوں کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگی۔ اس لحاظ سے "گلِ رعنا" کو تذکرہ نگاری کی روایت کی توسیع ہی کہا جائے گا۔

نصیرالدین ہاشمی کی "دکن میں اردو" علاقائی ادبی تاریخوں میں پہلی کتاب ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی تقلید میں متعدد علاقائی تاریخیں جیسے "پنجاب میں اردو"، "سندھ میں اردو"، "بنگال میں اردو" وغیرہ لکھی گئیں۔ موجودہ تحقیق کی روشنی میں ہاشمی صاحب کے بعض بیانات تصحیح طلب معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم یہ کتاب آج بھی دکنی ادب کے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب "اردوئے قدیم" بھی دکنی زبان و ادب سے متعلق ہے۔ اس میں اٹھارویں صدی کے ربع دوم تک کے شعری اور نثری کارناموں کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ دکنی زبان و ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے "اردوئے قدیم" حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "تاریخ ادبِ اردو" انگریزی میں لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ ترمیم و اضافے کے ساتھ مرزا محمد عسکری نے کیا ہے۔ اس کتاب میں دکنی مصنفین کے بارے میں چند فروگذاشتیں ضرور ملتی ہیں تاہم یہ اردو کی چند اہم ادبی تواریخ میں شمار ہوتی ہیں۔ اس میں ابتداء سے اکبر الہ آبادی تک کے شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے۔ اس میں تاریخِ اردو کا تسلسل نہیں ملتا۔ اردو زبان کے مولد

تک مجھے علم ہے اس کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ یہ کام نہایت خوبی کے ساتھ
۔ تکمیل کو پہنچ سکے گا (۴) ۔ لیکن کسی وجہ سے اردو شہ پارے کی دوسری اور
جلد کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ نہیں سکا۔

اردو شہ پارے کی پہلی جلد جملہ ۳۸۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس میں
، مقدمہ ، فرہنگ ، اشاریہ اور ضمیموں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی ، محمد قلی
شاہ ، عبداللہ قطب شاہ ، ملک الشعرا غواصی ، ابن نشاطی ، شاہ راجو ، ابوالحسن
کی تصویریں ، کلیات محمد قلی کے قلمی نسخے کی بعض منظومات کے عکس کے علاوہ
سے عہد ولی تک کی شعری اور نثری تصانیف کے انتخابات بھی شامل ہیں ۔
شہ پارے " کو ڈاکٹر زور نے درج ذیل چار ابواب میں تقسیم کیا ہے:

ا اردو ادب کی ابتدائی کوششیں (۲) اردو ادب بیجاپور میں
۱) اردو ادب گولکنڈہ میں (۴) اردو ادب مغلوں کی حکومت میں

ب میں ابتداً شمالی ہند کے شعرا مسعود سلمان اور امیر خسرو کا ذکر کیا گیا ہے اور
ت و دکن کے سخنوروں باجن ، علی گام دھنی ، خوب محمد ، عین الدین گنج العلم ،
ندہ نواز ، عبداللہ حسینی کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی ہے ۔

دوسرے باب میں دبستان بیجاپور سے متعلق شاعروں اور نثر نگاروں کے ادبی
ں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس خصوص میں میراں جی شمس العشاق ، برہان الدین
مقیمی ، امین ، صنعتی ، رستمی ملک خوشنود ، ملک الشعرا نصرتی ، ہاشمی بیجاپوری
غیرہ کے واقعات حیات اور ان کی ادبی خدمات کا دستیاب مواد کی روشنی میں
ا گیا ہے ۔ اس باب میں ڈاکٹر زور نے علی عادل شاہ ثانی شاہی کی شعری خدمات
ہ جائزہ اس لیے نہیں لیا ہے کہ غالباً اس وقت تک شاہی کے دیوان کا پتہ نہیں
ا تھا ۔ ملک خوشنود کی مثنوی " جنت سنگار " کے سہواً انھوں نے دو نام " بازار
اور " یوسف زلیخا " بتائے ہیں ۔ نصرتی کی حیات اور شاعری کا مفصل جائزہ لیتے
س کی مثنوی نگاری اور قصیدہ گوئی پر اچھی بحث کی ہے ۔ مثنوی نگاری کے سلسلے
وں نے نصرتی کی صرف دو مثنویں " گلشن عشق " اور " علی نامہ " کے نام لیے ہیں
ا اسکندری " کا ذکر نہیں کیا غالباً یہ مثنوی بھی اس زمانے کے اہل علم کی نگاہوں

سے اوجھل رہی اس باب میں بعض شاعروں اور نثرنگاروں اور ان کی تصانیف کا پہلی بار اسی کتاب میں تذکرہ ملتا ہے۔

تیسرے باب میں "اردو ادب گولکنڈہ میں" کے عنوان سے قطب شاہی عہد کے شعروادب کے منتخب نمونے اور ان کے مصنفین کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب کو ڈاکٹر زور نے "ابتدائی تحریکات" اور "اردو ادب کا سنہری دور" کے زیر عنوان مزید دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں فیروز اور محمود کو دبستانِ گولکنڈہ کے اولین شاعروں کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے اور دوسرے حصے میں محمد قلی قطب شاہ، اسد اللہ وجہی، احمد گجراتی، میراں جی خدانما، حسن شوقی، ملا خیالی، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، قطبی، سلطان، جنیدی ابنِ نشاطی، میراں یعقوب طبعی، امین، ابوالحسن تاناشاہ، فائز، لطیف، نوری، شاہی، مرزا اور غلام علی کی نظم و نثر کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور بعض مصنفین کے منتخب ادبی نمونے بھی بھی پیش کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور کو ملا خیالی کے زمانے کا تعین کرنے میں سہو ہوا ہے۔چناں چہ خیالی کو انھوں نے محمد قطب شاہ کے دور (۱۰۲۰ھ۔۱۰۳۵ھ) سے متعلق شعرا میں شمار کیا ہے حالاں کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد (۹۵۷ھ۔۹۸۸ھ) کا شاعر اور فیروز اور محمود کا ہم عصر تھا۔محمد قطب شاہ کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے صفحہ ۱۷۹۔۱۸۰ پر درج ذیل منظومات نمونتاً پیش کی ہیں:

ط چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا   ط خداداد محل کوں محمدؐ سنوارا

ط ہوا آئی ہے لیکے بھی تھنڈ کالا   ط چلے چندنی میں لٹک جب پیو ہمارا

یہ چاروں منظومات محمد قطب شاہ کی نہیں بلکہ محمد قلی قطب شاہ کی ہیں۔بعد کو ڈاکٹر زور نے جب کلیاتِ محمد قلی کی ترتیب وتدوین کی تو خود انھوں نے مذکورہ کلام کو بالترتیب ص ۲۴۷، ۲۱۱، ۲۰۸ اور ۲۹۶ پر شامل کیا ہے۔اسی طرح عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کے منتخبات میں ص ۲۴۹ پر درج ذیل غزلوں کا بھی انتخاب کیا گیا ہے۔یہ غزلیں دراصل ملک الشعرا غواصی کی ہیں اور اس کے قلمی دیوان میں بالترتیب صفحہ نمبر ورق ۱۶ اب اور ۲۰ الف پر درج ہیں:

؎ گفتم کہ اے پری تو ہے فتنہء زمانہ ؎ اے پری پیکر ترا مکہ آفتاب

غواصی کی نو دریافت مثنویاں "یناست و نتی" اور "مثنوی طریقت" اس کتاب کی اشاعت کے بعد دریافت ہوئی ہیں اس لیے ان مثنویوں کے تذکرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اردو شہہ پارے کے چوتھے اور آخری باب میں عہدِ مغلیہ کے شعراء اور نثر نگاروں کے چند منتخبات پیش کیے گئے ہیں اور ان کی ادبی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس باب کو ڈاکٹر زور نے مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) شمالی ہند میں اردو (۲) دکن میں اردو

(۳) مرثیہ نگار (۴) نثر نگار

پہلے حصے میں شمالی ہند کے شاعروں افضل، شیخ جیون اور جعفر زٹلی کے واقعات حیات اور ان کے شعری محاسن بیان کیے گئے ہیں۔دوسرے حصے میں دکن اور گجرات کے مندرجِ ذیل شعرا پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے:

عاجز، ضعیفی، ذوقی، بحری، مجرمی، احمد، ولی ویلوری، اشرف، عشرتی، ولی اورنگ آبادی، شاہ محمد اور وجدی۔

تیسرا حصہ اس دور کے مرثیہ نگار اور ان کے کلام کی خصوصیات پر مبنی ہے جس میں امامی، رضی، سید، غلامی، قادر اور ہاشم علی کے غیر مطبوعہ مرثیوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر شاعر کے مراثی کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔اس باب کا آخری حصہ مغلیہ دور کے نثری کارناموں سے متعلق ہے جس میں نامعلوم مترجم کی قلمی کتاب "طوطی نامہ" اور نامعلوم مصنفین کے قصے "اخلاقِ ہندی" اور شریعت نامہ کو متعارف کروایا گیا ہے اور ان کی نثر نگاری کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔

اس باب کے دوسرے حصے میں عاجز تخلص کے قدیم شاعر کی مثنوی "ملکہء مصر" کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔لیکن مذکورہ مثنوی کا مصنف عاجز نہیں بلکہ "محمود" ہے

جس کا نام اس میں بار بار آیا ہے۔ ولی ویلوری کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے سہواً اس کی دیگر تصانیف "روضتہ الانوار، روضتہ العقبیٰ، دعائے فاطمہ اور اگر و ملاگیر" کا ذکر نہیں کیا تاہم اس بات کا قوی امکان ہے کہ ان میں سے چند مثنویاں اس کتاب کی اشاعت کے بعد دریافت ہوئی ہوں۔ ولی ویلوری کی مثنوی "روضتہ الشہدا" کے بارے میں زور صاحب کا درج ذیل تبصرہ حقائق پر مبنی ہے:

"اس کو (دہ مجلس کو) ولی اورنگ آبادی کی تصنیف خیال کیا جاتا ہے لیکن راقم کی رائے میں "دہ مجلس" اس مشہور و معروف ولی کی تصنیف نہیں بلکہ یہی "روضتہ الشہدا" ہے جس کا نام دہ مجلس بھی ہے۔ اورنگ آباد کے ولی نے اس نام کی کوئی تصنیف نہیں لکھی ہے۔ حال ہی میں ولی کا جو کلیات طبع ہوا ہے اس میں دہ مجلس کے جو چند اشعار درج ہیں وہ فی الحقیقت ویلور کے ولی کے ہیں" (۵)۔

اس باب کے تیسرے حصے میں مغلیہ دور کے مرثیہ نگاروں کو پہلی بار متعارف کروایا گیا ہے۔ اس حصے کے مطالعہ سے زور صاحب کی غیر معمولی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ مختلف مخطوطات اور قلمی بیاضوں کی چھان بین کر کے غیر مطبوعہ مرثیوں کی ترتیب و تدوین کی ہے بلکہ ان کے مصنفین کے واقعات حیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مختصر یہ کہ چند ایک معمولی تسامحات سے قطع نظر "اردو شہہ پارے" اردو کی اولین اور معتبر تواریخ ادب میں شمار ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے جس زمانے میں یہ کتاب قلم بند کی یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو ادب اپنی تہی دامانی کا شکوہ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر زور نے ممکن الحصول ذرائع سے دستیاب معلومات اور مواد کی روشنی میں اردو شہہ پارے کو ایک مستند کتاب بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ تاہم وہ اس بات سے بھی بہ خوبی واقف تھے کہ اس نوعیت کے تحقیقی کام کبھی بھی مکمل اور حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"اس امر کا کوئی بھی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں جو کام پیش کر رہا ہوں وہ ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ آئے دن دکنی دور کی جو نئی

نئی کتابیں برآمد ہوتی جاتی ہیں ان کی رفتار ظاہر کرتی ہے کہ بہت جلد ہمیں اس جلد کا ضمیمہ یا دوسرا حصہ شائع کرنا پڑے گا ۔ بہ حالت موجودہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں ان تمام قلمی تصنیفات کے انتخابات دے دیے گئے ہیں جو اس وقت دست یاب ہو سکی ہیں یا جنھیں ادبی حیثیت حاصل ہے ۔ یہی حال مقدمہ کا بھی ہے جس میں ان شہ پاروں اور ان کے مصنفین پر تاریخی حیثیت سے نظر ڈالی گئی ہے ۔ یہ بھی اس دور کے ادب اردو کی ایک مکمل تاریخ نہیں ہو سکتی جتنی معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں ان کے پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے "(۶)۔

عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی: یہ کتاب ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں اعظم پریس حیدرآباد سے شائع ہوا۔ "عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی " جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں کے پچیس سالہ دورِ حکومت میں اردو شعر و ادب کی نشو و نما کے جائزے پر مبنی ہے ۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا حصہ نواب میر عثمان علی خاں کی فیاضانہ اردو نوازیوں کا احاطہ کرتا ہے جس میں ایک طرف خسروِ دکن کی اردو شاعروں ، انشا پردازوں ، انجمنوں اور اداروں کی سرپرستی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں تو دوسری طرف اس دور کے اردو رسائل اور اخبارات کو سلطان وقت کی امداد کے تذکرے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ اور اس کے دار الترجمہ کے قیام کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر زور کا بیان ہے کہ اس پچیس سالہ دور میں لگ بھگ چار ہزار کتابیں قلم بند کی گئیں "(۷)۔

"عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی " کے دوسرے حصے میں اس علم دوست بادشاہ کی سرپرستی اور قدر افزائی کے ہمہ گیر اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں فرزندان جامعہ عثمانیہ اور جامعہ عثمانیہ کے باہر کے شعراء اور ادیبوں کی اردو خدمات کا انفرادی خدمات کے عنوان سے مجمل جائزہ لیا گیا ہے اور اجتماعی خدمات کے زیرِ عنوان درج ذیل انجمنوں اور اداروں کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

(۱) انجمن ارباب اردو (۲) مکتبہ ابراہیمیہ (۳) مجلس علمیہ (۴) بزم اردو نظام کالج (۵) سلسلہ ادبیات اردو (۶) لٹریری اکیڈیمی (۷) انجمن طیلسانین عثمانیہ (۸) انجمن طلبائے قدیم سٹی کالج (۹) انجمن ترقی ڈرامہ (۱۰) بزم تمثیل۔

اس حصے میں زبان کی اصلاح و ترقی اور حیدرآباد کے باہر دوسری ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو کے استحکام اور اس کے غیر معمولی اثرات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں دور عثمانی کے ۱۵۲ شعرا اور ادیبوں، ۱۸ انجمنوں اور اداروں اور ۸۶ اخباروں اور رسالوں کا تذکرہ زیر بحث آیا ہے۔

ڈاکٹر زور نے دور عثمانی کی اردو خدمات اور شاہی سرپرستی کا عہد ہائے ماضی کے علم دوست سلاطین کے علاوہ دہلی اور لکھنو کے ادب پرور حکم رانوں سے تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حضرت سلطان العلوم کا دور حکومت اردو کی ترقی کے لحاظ سے گذشتہ تمام عہدوں سے ممتاز ہے اور یہ امتیاز نہ صرف دکن کے عہد ہائے ماضی تک محدود ہے بلکہ تمام ہندستان میں کہیں اور کسی وقت بھی اردو زبان اور ادب کی سرپرستی اس اعلیٰ پیمانہ پر نہیں کی گئی۔ دہلی کے آخری چند فرماں روا، محمد شاہ، شاہ عالم، اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر، لکھنو کے دو تین حکم ران مثلاً آصف الدولہ اور واجد علی شاہ اردو شعر و سخن کی قدردانی کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن ان میں سے بھی کسی نے اردو کی تعمیر ایسی مستحکم بنیادوں پر نہیں کی جو عہد عثمانی میں محض سلطان العلوم کی مآل بینیوں کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئیں۔ عہد رفتہ کی تمام اردو نوازیاں صرف ادبیات اور شعر و سخن تک محدود تھیں لیکن اس عہد میں اردو کو اس قدر وسعت دی گئی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبانوں کی طرح ہر قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید علوم و فنون و حکمیات کی حامل ہو گئی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو ہندستان کی کسی اور زبان کو اب تک حاصل نہ ہو سکی" (۸)۔

" عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی " اپنے موضوع پر ایک مکمل اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کے مطالعہ سے ایک طرف نواب میر عثمان علی خاں کی علم دوستی اور اہلِ علم کی قدر افزائی پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر زور کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں اور تاریخ وادب پر ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

داستانِ ادب حیدرآباد: ڈاکٹر زور کی مولفہ ادبی تواریخ میں " داستانِ ادب حیدرآباد " کی اہمیت اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ، یہ کتاب بھی دراصل " اردو شہ پارے " اور عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی " کی طرح تاریخِ ادب کے تسلسل اور حیدرآباد کی ادبی تاریخ پر محیط ہے ۔ ۲۲۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۹۵۱ء میں طارق پریس حیدرآباد سے عمل میں آئی ۔ داستانِ ادب حیدرآباد میں ۱۰۰۰ھ سے ۱۳۷۰ھ تک کے اردو ، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے شعرا اور نثر نگاروں کے علمی وادبی کارناموں سے متعلق ضروری اور اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔ اردو کے ساتھ عربی و فارسی شعرا اور ادیبوں کی اس کتاب میں شمولیت کا جواز پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے لکھا ہے ۔ " گذشتہ نصف صدی سے حیدرآباد میں اجتماعی طور پر اردو ہی کی طرف زور دیا گیا اور شہر کے وہ باکمال پس منظر میں چلے گئے جنھوں نے عربی و فارسی کے ذریعے سے اپنی صاحب کمالی کے ثبوت دیے تھے ۔ حالاں کہ اس شہر کی تہذیب و شائستگی کے سنوارنے میں وہ نہ صرف شریک بلکہ شریکِ غالب رہے ہیں " (۹) سچوں کہ ڈاکٹر زور نے قطب شاہی اور آصف جاہی عہد کی تاریخ و ادب کو بہ طورِ خاص اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اس لیے مختلف ادوار میں حیدرآباد میں ابھرنے والی علمی وادبی تحریکوں اور ان کے پس منظر کے پہلو بہ پہلو جملہ اربابِ کمال کے مختصر واقعاتِ حیات اور ان کے رشحاتِ قلم کی خصوصیات سے بھی قارئین کو واقف کروانے کی بھرپور کوشش کی ہے ۔ داستانِ ادب حیدرآباد کو ڈاکٹر زور نے درجِ ذیل دس ابواب میں منقسم کیا ہے ۔

(۱) ابتدائی دور	(۱۰۰۰ھ تا ۱۰۵۰ھ)
(۲) عہد ابن خاتون و ابن نشاطی	(۱۰۵۰ھ تا ۱۱۰۰ھ)
(۳) دورِ انتشار	(۱۱۰۰ھ تا ۱۱۵۰ھ)

(۴) ادب و شعر کا احیاء (۱۱۵۰ھ تا ۱۲۰۰ھ)

(۵) عہدِ ارسطو جاہ (۱۲۰۰ھ تا ۱۲۲۰ھ)

(۶) چندا اور چندو لال (۱۲۲۰ھ تا ۱۲۵۰ھ)

(۷) شمس الامرا اور شمس الدین فیض (۱۲۵۰ھ تا ۱۲۸۰ھ)

(۸) مختار الملک اور وقار الامرا (۱۲۸۰ھ تا ۱۳۲۰ھ)

(۹) عہد کشن پرشاد یمین السلطنت (۱۳۲۰ھ تا ۱۳۵۰ھ)

(۱۰) جامعہ عثمانیہ –

مذکورہ ابواب کی تقسیم اور ان کی وسعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اتنی وسعت اور اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر ایک علاحدہ اور بسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے (۱۰)۔ اس کتاب میں حیدرآباد میں عربی، فارسی اور اردو ادب کے اولین نمونوں سے لے کر تالیف کے وقت تک جملہ اربابِ علم و فن اور ان کے کارناموں کا تعارف نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کروایا گیا ہے۔

" داستانِ ادب حیدرآباد " کی جامعیت اور ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ضیاالدین انصاری تحریر کرتے ہیں:

> " یہ حیدرآباد کی ادبی اور علمی زندگی پر اچھی اور جامع کتاب ہے موجودہ زمانے کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اور دل چسپ باب جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہے۔ اس کے قیام کے پس منظر، اس کی تاریخ اور اسی کے ساتھ دارالترجمہ کے علمی و ادبی کارناموں کی تفصیلات آج بھی معنویت رکھتی ہیں " (۱۱)۔

جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے قیام کے سلسلے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں ۔ مولانا موصوف تحریک جامعہ عثمانیہ کے اہم ترین علم برداروں میں شامل تھے اور خود انھوں نے بہ حیثیت صدر الصدور امورِ مذہبی اس کے قیام کی اجازت مرحمت فرمائی تھی لیکن نہ جانے کیوں ڈاکٹر زور نے اس اہم کتاب میں ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالاں کہ " عہد عثمانی میں اردو کی ترقی " میں ان کا تذکرہ موجود ہے ۔

دکنی ادب کی تاریخ: ۱۸۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں کراچی اردو اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہوئی۔ تاریخ ادب سے متعلق ڈاکٹر زور کی دیگر تصانیف میں یہ کتاب اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں ۱۳۵۰ء سے ۱۷۵۰ء تک اردو زبان و ادب کے قدیم مراکز گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گول کنڈہ اور اورنگ آباد کے شعرا اور ادیبوں کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ "دکنی ادب کی تاریخ" کو ڈاکٹر زور نے چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں "بہمنی دور" (۱۳۵۰ء۔۱۵۲۵ء) کے تاریخی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کے علاوہ اس دور کے دس شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں حضرت خواجہ بندہ نواز، نظامی بیدری، مشتاق، لطفی، فیروز، میراں جی شمس العشاق اور اشرف کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرا باب "عادل شاہی دور" (۱۴۹۰ء۔۱۶۸۶ء) کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے علاوہ ان سلاطین کی ادب نوازیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دبستانِ بیجاپور کے ادیبوں اور سخن دروں کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ابراہیم عادل شاہ، برہان الدین جانم، عبدل، قطب رازی، مقیمی، امین، دولت، مرزا ظہور، حسن شوقی، رستمی، ملک خوشنود، علی عادل شاہ شاہی، امین الدین اعلیٰ، ہاشمی بیجاپوری اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

چوتھے باب میں "ابتدأ" قطب شاہی عہد" (۱۵۰۸ء۔۱۶۸۷ء) کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو اجاگر کیا گیا ہے اور پھر سلاطینِ گول کنڈہ کی علمی و ادبی سرپرستی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے اردو شعرا اور ادباء کی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں شامل چند اہم مصنفین کے نام یہ ہیں:
وجہی، محمد قلی قطب شاہ، احمد گجراتی، غواصی، عبداللہ قطب شاہ، ابنِ نشاطی، میراں یعقوب، جنیدی، طبعی، میراں جی خدانما وغیرہ۔

پانچویں باب "مغل عہد" (۱۶۸۶ء۔۱۷۵۰ء) میں زوال گول کنڈہ و بیجاپور کے بعد حیدرآباد اور اورنگ آباد میں نشو و نما پانے والے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کے شعرا میں قاضی محمود بحری، ضعیفی، عشرتی، ذوقی، وجدی، فراقی، ولی

ویلوری، جعفر زٹلی، ولی اورنگ آبادی، داؤد اور سراج اورنگ آبادی کے نام اہم ہیں۔

چھٹے باب کے عنوان "دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر" ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں ڈاکٹر زور نے شمالی ہند میں دکنی شاعری کے تتبع اور تسلسل کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور شمالی ہند کے اولین شاعروں کے کلام پر دکنی شاعری کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔

اس کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر زور نے دکنی ادب سے متعلق اپنی تالیف "اردو شہہ پارے" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اردو شہہ پارے" نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور بزرگی میں بڑا حصہ لیا تھا مگر اپنے موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں بعض خامیاں بھی تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی اور بیانات ظن اور قیاس پر مبنی تھے" (۱۲)۔

دکنی ادب کی تاریخ "چوں کہ تقریباً چالیس سال قدیم کتاب ہے اور اب تک اس کا مرمہ ایڈیشن شائع نہیں ہوا ہے اس لیے آج اس کتاب میں بھی ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں دکنی اردو سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اور بعض شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں نئی معلومات سامنے آئی ہیں مثلاً ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مدلل طور پر خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالے "معراج العاشقین" کو عادل شاہی دور کے ایک اور بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ احمد گجراتی کی ایک اور مثنوی "یوسف زلیخا" منظر عام پر آئی ہے جو دبستان گول کنڈہ کی پہلی مثنوی ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں وجہی کے فارسی دیوان کا ایک نسخہ دریافت ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام وجیہہ الدین وجہی یا وجیہہ اللہ وجہی نہیں بلکہ اسد اللہ وجہی تھا۔ فیروز محمود اور حسن شوقی کی متعدد غزلیں شائع ہوئی ہیں، غواصی کی ایک اور شعری تصنیف "مثنوی طریقت" دریافت ہوئی ہے مذکورہ بالا چند ایک نئی دریافتوں کے قطع نظر یہ

کتاب آج بھی دکنی ادب کی ایک مقبول اور معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔

اردو کے اسالیب بیان: ڈاکٹر زور کے مرتبہ تواریخ ادب کی ایک کڑی "اردو کے اسالیب بیان" ہے تاہم اس کتاب کا شمار اردو نثر کی تواریخ ادب کے زمرے میں ہوگا۔ اس قبیل کی دیگر ادبی تاریخوں میں سب سے پہلے محمد یحییٰ تنہا کی سیر المصنفین (دو جلدیں) ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی، اس کے بعد احسن مارہروی کی کتاب "نمونہ منشورات" کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی اور پھر سید محمد اور حامد حسن قادری کی کتابیں "ارباب نثر اردو" اور "داستان تاریخ اردو" علی الترتیب ۱۹۲۹ء اور ۱۹۴۱ء میں منظر عام پر آئیں۔

"اردو کے اسالیب بیان" ابتداً ایک طویل مضمون کی صورت میں لکھا گیا تھا اور یہ "سہیل" علی گڑھ کے اپریل اور جولائی ۱۹۲۶ء کے شمارے میں قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ موجودہ شکل میں یہ کتاب ۱۲۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ محمد یحییٰ تنہا کی "سیر المصنفین" کے بعد "اردو کے اسالیب بیان" پہلی ادبی تاریخ ہے جس میں اردو نثر کے ابتدائی نمونوں سے لے کر کتاب کی تالیف کے وقت تک کے تمام انشاپردازوں کے کارناموں کا عہد بہ عہد رونما ہونے والے تغیرات اور رجحانات کے پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا:

(۱) اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے
(۲) دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو و نما
(۳) شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل
(۴) فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں
(۵) غدر اور اس کے قریبی زمانے میں نثر کی حالت
(۶) سر سید کی کوشش کا اثر
(۷) موجودہ انشاپردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب
(۸) اردو نثر کے رجحانات

(۹) اردو نثر کا مستقبل

حواشی:

(۱) پروفیسر گیان چند جین ۔ ذکر و فکر ص ۲۱۳۔
(۲) ایضاً ۲۲۰۔
(۳) ایضاً۔
(۴) ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ اردو شہہ پارے ص ۳۔
(۵) ایضاً ص ۱۴۵۔
(٦) ایضاً ص ٦۔۷۔
(۷) ڈاکٹر زور ۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی ۔ ص ۸
(۸) ایضاً ص ۱۲۔
(۹) ڈاکٹر زور ۔ داستانِ ادب حیدر آباد ۔ ص ۱۴۔
(۱۰) ایضاً ص ۱٦۔
(۱۱) ضیا الدین انصاری ۔ زور صاحب کی تصانیف کا تعارف مشمولہ " محی الدین قادری زور " ص ۱۷۷۔
(۱۲) ڈاکٹر زور ۔ دکنی ادب کی تاریخ ۔ ص ۷۔

○ ○ ○

ڈاکٹر زور بہ حیثیت مدوّن متن

تدوین متن کے میدان میں ڈاکٹر زور کے کارناموں کا جائزہ لینے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تدوین متن کے بارے میں ابتدائی معلومات اور بنیادی باتوں کا علم حاصل کیا جائے۔ تدوین متن ادبی تحقیق کا ایک اہم شعبہ ہے۔ انگریزی میں اسے Textual Criticism کہتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کا ترجمہ "متنی تنقید" کیا ہے لیکن اردو میں تنقید کی اصطلاح ایک الگ مفہوم رکھتی ہے اور ادب کے ایک جداگانہ شعبہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس میں کسی ادب پارے کے محاسن و معائب کا جائزہ لے کر اس کی ادبی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ متنی تنقید کی اصطلاح سے ذہن ادب پارے کی قدر بندی کی طرف جاتا ہے اس التباس سے بچنے کے لیے ڈاکٹر گیان چند نے متنی تنقید کے بجائے تدوین متن کی اصطلاح کو ترجیح دی ہے (۱) اردو میں اس کے لیے ترتیب متن کی اصطلاح بھی مروج ہے۔ ترتیب اور تدوین قریب المعنیٰ ہیں۔ ترتیب کے معنیٰ کسی شئے کے اجزاء کو مناسب تقدیم و تاخیر سے رکھنا ہے۔ تدوین کے معنیٰ متفرق اجزاء کو اکٹھا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرنا ہے (۲)۔ ترتیب ایک عام لفظ ہے۔ تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے۔ اس لیے تدوین متن ایک نہایت مناسب اصطلاح ہے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ تدوین متن سے کیا مراد ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے تدوین متن کی تعریف اس طرح کی ہے "کسی متن کو اس طرح پیش کرنا جس طرح مصنف نے اسے آخری بار لکھا تھا۔ اس عمل کا نام تدوین ہے (۳)۔

تدوین متن، کسی شاعر یا ادیب کی کسی تصنیف کے مختلف قلمی یا مطبوعہ نسخوں کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ اس کے متن کی، اس صورت کی بازیافت کو کہتے ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

"متنی تنقید [تدوینِ متن] کا اصل مقصد حتی الامکان متن کو اصل روپ میں دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ اصل روپ سے مراد وہ روپ ہے جو متن کا مصنف اپنی تحریر کو دینا چاہتا تھا" (۴)۔

بعض دفعہ کسی متن کے متعدد نسخے ملتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کر کے صحیح متن تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی کسی متن کا ایک ہی نسخہ ملتا ہے جسے وحید نسخہ کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسی ایک نسخے کا مطالعہ کر کے مصنف کے اصل متن کی باز تشکیل کی کوشش کی جاتی ہے۔

تدوینِ متن ایک نہایت دیدہ ریزی اور عرق فشانی کا کام ہے۔ بعض محققوں مثلاً رشید حسن خاں نے اسے تحقیق سے آگے کی منزل بتایا ہے (۵)۔ تدوینِ متن کا کام انجام دینے کے لیے محقق میں تحقیقی صلاحیتوں کے علاوہ اور بہت سے اوصاف کا ہونا بھی لازمی ہے جیسے علم بیان، علم معانی اور علم بدیع پر وہ ماہرانہ عبور رکھتا ہو۔ علم عروض، قافیہ و ردیف اور مختلف اصنافِ سخن کی شعریات سے اچھی طرح آشنا ہو۔ تلفظ اور املا کے مسائل کا رمز شناس ہو۔ زبان کے قدیم اسالیب اور دبستانی اختلاف کا علم رکھتا ہو۔ فارسی زبان سے واقف ہو۔ مخطوطہ شناسی میں ملکہ رکھتا ہو اور سب سے بڑھ کر تدوین کے طریقۂ کار اور اصول و آداب سے ذہنی لگاؤ اور مزاجی مناسبت رکھتا ہو۔ ان صلاحیتوں کے بغیر وہ متن کے حواشی، مقدمہ، متن کا زمانہ تصنیف، مصنف سے متن کا انتساب، مصنف کے عہد، زمانۂ کتابت، داخلی شواہد کے تعین اور ایسی بہت سی دیگر وضاحتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک ڈاکٹر زور کے تدوینی کارناموں کا تعلق ہے مبداءِ فیاض نے انھیں تحقیقی مزاج کے ساتھ ساتھ تدوینِ متن کے لیے درکار مذکورہ بالا صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قدیم ادب کے شہ پاروں کی تدوین میں بے نظیر کارنامے انجام دیے۔ ان کی کاوشوں کے سبب متعدد اردو شہ پارے گوشۂ گمنامی سے نکل کر منظرِ عام کی رونق بنے۔ ذیل میں ڈاکٹر زور کے تدوینِ متن سے متعلق کارناموں کا مفصل جائزہ لیا جاتا ہے۔

گلزارِ ابراہیم: ڈاکٹر زور نے انجمن ترقی اردو ہند کی فرمائش پر علی ابراہیم خاں

کے تذکرہ "گلزار ابراہیم" کی تدوین کی تھی ۔ان کا مرتبہ یہ تذکرہ ۱۹۳۴ء میں مطبع
مسلم یونیوسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا ۔یہ اردو شعراء کا ایک اہم تذکرہ ہے ۔اس کے
مولف علی ابراہیم خاں عظیم آباد کے ایک موضع شیخوپورہ میں ۱۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے
تھے (۶) ۔وہ اردو کے ایک نامور مورخ، ادیب اور شاعر تھے ۔ گورنر جنرل کارنوالس
کے زمانے میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ اور بعد میں گورنر بھی بنے ۔انھوں نے ۱۲۰۸
ھ میں بنارس ہی میں وفات پائی (۷) ۔علی ابراہیم کی شہرت کا دارومدار تذکرہ گلزار
ابراہیم پر ہی ہے ۔انھوں نے یہ تذکرہ ۱۱۹۸ھ میں فارسی میں لکھا تھا ۔اس میں ۳۱۹
شعراء کے حالات اور کلام کے نمونے محفوظ ہیں ۔ان کی تصانیف میں ایک اور
تذکرے "صحف ابراہیم" کا بھی نام آتا ہے ۔لیکن قاضی عبدالودود کی رائے میں صحف
ابراہیم اور گلزار ابراہیم ایک ہی تذکرے کے دو نام ہیں (۸) ۔

گلزار ابراہیم اپنے عہد کا ایک اور مقبول تذکرہ تھا ۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے
منشی سید حیدر بخش حیدری نے "گلشن ہند" کے نام سے اردو میں اس کا ترجمہ اور
تلخیص شائع کی ۔اس کے ایک سال بعد ۱۸۰۱ء میں مرزا علی لطف نے فورٹ ولیم کے
ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے حسب الحکم "گلشن ہند" ہی رکھا (۹) ۔مرزا علی لطف کا مولفہ
گلشن ہند مولانا شبلی نعمانی کی ترتیب وتدوین اور مولوی عبدالحق کے پر از معلومات
مقدمے کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں لاہور سے شائع ہوا ۔ گلزار ابراہیم میں ۳۱۹ شعراء کے
احوال مذکور ہوئے ہیں جب کہ گلشن ہند میں صرف ۷۰ شاعروں کے حالات درج ہیں
جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہوا ہے انجمن ترقی اردو کی فرمائش پر ڈاکٹر زور نے
یہ کتاب مرتب کی تھی اور اس کی طباعت لطف کے تذکرہ گلشن ہند مرتبہ شبلی نعمانی
کے ساتھ ہوئی ۔زور صاحب کے مرتبہ متن میں ان شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ
کلام شامل ہے جو تذکرہ "گلشن ہند" میں شامل نہیں ہیں ۔انھوں نے اپنے متن میں
گلشن ہند کے اضافی مواد کو شامل کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ گلشن ہند کا اضافہ ہے
اور جہاں کوئی اضافہ نہیں وہاں لکھ دیا ہے کہ کوئی اضافہ نہیں ہے ۔اور جن شعراء کا
تذکرہ گلزار میں اور گلشن میں نہیں ہے، ان کے متعلق گلزار کی عبارت نقل کی ہے

(۱۰) ۔لطف نے گلشن ہند میں گلزار ابراہیم کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا ہے ۔ ڈاکٹر زور نے اپنے مرتبہ متن میں اختلافات کی نشاندہی بھی کی ہے ۔

گلزار ابراہیم کے آغاز میں زور صاحب نے ایک مفید اور معلوماتی مقدمہ بھی تحریر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ "عام طور پر تذکرہ نگار شعراء کے حالات سے زیادہ نمونہ کلام کو اہمیت دیتے ہیں ۔ لیکن علی ابراہیم نے شعراء کی زندگی کے حالات کی تحقیق پر زیادہ توجہ دی ہے ۔" علی ابراہیم وہ واحد تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے شاعروں کے حالات اور ان کے متعلق تاریخیں جمع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں (۱۱) ۔ اس تذکرے کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس سے بارھویں صدی ہجری سے قبل شمالی ہند میں اردو ادب کی نشو و نما اور اس عہد کی مقبول و مروج اصناف سخن کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں ۔

تذکروں کی عام روش کے مطابق گلزار ابراہیم بھی حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے ۔ ڈاکٹر زور نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر یہ تذکرہ ہجائی ترتیب کے بجائے تاریخی ترتیب کے مطابق لکھا جاتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی لیکن اس خامی کے باوجود انھوں نے اسے اردو کے سب تذکروں سے بہتر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے ۔

> "یہ واقعی اردو شاعروں کی بد قسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورخ بن کر ان کے حالات کو قلم بند نہیں کیا ، لیکن اگر اس طرح کی کوشش ملتی ہے تو علی ابراہیم خان کا زیر بحث تذکرہ ہے جو اگرچہ ٹھیٹ تاریخی نقطہ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے ۔ تاہم اس لحاظ سے اردو کے سب تذکروں سے بہتر ہے ۔" (۱۲) ۔

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ: اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، سلطنت گولکنڈہ کے پانچویں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضخیم کلیات کی تدوین ڈاکٹر زور کا سب سے اہم اور بے مثال کارنامہ ہے ۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے کتب خانہ ، سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ تین مخطوطوں اور پروفیسر آغا حیدر حسن کے مملوکہ ایک قلمی نسخے کی مدد سے تین سال کی کڑی محنت اور جاں فشانی کے بعد مرتب و مدون کیا ہے ۔ اس کتاب کی

ترتیب وتدوین کے وقت کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مخزونہ محمد قلی کے کلیات کا وہ اہم اور مکمل نسخہ ناپید ہو چکا تھا جس پر مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء میں ایک مفصل تعارفی مضمون شائع کیا تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں مخزونہ کلیات محمد قلی کے مخطوطات میں ایک نہایت قدیم ہے۔ اس نسخہ میں طلائی کام کیا گیا ہے اور یہ باتصویر بھی ہے۔ اس کی کتابت سلطان محمد قلی کی زندگی ہی میں ہوئی تھی۔ اس مخطوطے کو خاص سلطان ہی کے لیے بڑے اہتمام اور لوازمات کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ اس نسخے کی اکثر غزلوں اور نظموں میں محمد قلی نے اپنا تخلص معانی استعمال کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں قطب یا قطب شہ بھی ملتا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کا ایک اور مخطوطہ بھی شاہی نسخہ ہے لیکن یہ محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس نسخے میں اکثر مقامات پر شاعر نے اپنا تخلص قطب شہ استعمال کیا ہے۔ اسی وجہ سے بعض محققوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ پہلا مخطوطہ سلطان محمد قلی کا کلیات ہے اور دوسرا مخطوطہ سلطان محمد قطب شاہ کا۔ ڈاکٹر زور نے نہایت باریک بینی اور عمدگی سے اس غلط فہمی کو دور کیا اور مستحکم دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ معانی اور قطب شہ محمد قلی ہی کے تخلص ہیں۔ محمد قلی کی وفات کے بعد کے مکتوبہ نسخے میں بعض مقامات پر الفاظ بدل دیے گئے ہیں اور خصوصاً مقطعوں میں معانی کے بجائے "قطب شہ" بطور تخلص لایا گیا ہے۔ اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زور لکھتے ہیں۔

> "معلوم ہوتا ہے کہ خود سلطان محمد قلی نے آخر کو معانی کی جگہ قطب شہ تخلص کو ترجیح دی تھی اس لیے پہلا دیوان مرتب ہونے کے بعد جو کچھ لکھا وہ اسی تخلص سے لکھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد سلطان محمد نے اس کا کلام مرتب کرتے وقت ہر جگہ معانی نکال کر قطب شہ ڈال دیا ہو" (۱۳)۔

کلیات محمد قلی کی تدوین ڈاکٹر زور کا ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی بدولت اردو زبان میں قدیم ترین شعراء کے دواوین و کلیات کی تلاش و تحقیق اور ترتیب وتدوین کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اردو میں تدوین متن کے جتنے بھی کام ہوئے ہیں

ان میں زور صاحب کا یہ کام ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا مدون کیا ہوا یہ کلیات رائل سائز کے ایک ہزار اڑسٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۴۰ء میں سلسلہ یوسفیہ حیدرآباد کے تحت مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے خاص اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی۔ اس کتاب میں تدوین کلام سے قبل ڈاکٹر زور نے ۳۳۵ صفحات پر مشتمل ایک بسیط اور پر مغز مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے نہ صرف سترہ مطبوعہ اور نوقلمی کتب تواریخ و سیر سے تحقیقی مواد فراہم کر کے محمد قلی کے حالات و سوانح پوری تفصیل کے ساتھ قلم بند کیے ہیں بلکہ اس کے عہد کی تہذیب و ثقافت کا بھی ایک مستند و دل آویز نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے محمد قلی کی شاعری کی تنقید و تحسین بھی کی ہے۔ اور اس کے کلام کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے کلام کی داخلی شہادتوں سے قطب شاہی عہد کے تہذیب و تمدن، طرز معاشرت، رسم و رواج، شہر کی تزئین و آرائش تہذیبی اور ثقافتی آثار پر نہایت شرح و بوسط کے ساتھ داد تحقیق دی ہے۔ اس مقدمے کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ سلطان محمد قلی کی شاعری کا مزاج اور ماحول خالص ہندوستانی ہے۔ اس میں جا بجا مقامی آب و رنگ او مناظر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس میں دکن کی مٹی کی خوشبو اور سرزمین دکن کے درختوں کی ٹھنڈک۔ یہاں کے پھولوں کی مہک اور پھلوں کے کھٹے میٹھے ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زور کے مرتبہ کلیات محمد قلی کے پہلے حصے میں مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی نظمیں ہیں جن کی تعداد ۲۲۰ ہے۔ ان میں حمد، نعت، منقبت، مدح سیدہ فاطمۃ الزہرہ۔ عید میلادالنبی، شب معراج، مولود علی، عید غدیر، شب برات، عید رمضان، بقر عید، نوروز، بسنت اور بارہ پیاریاں وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں ہر موضوع پر ایک سے زاید نظمیں ملتی ہیں جن سے شاعر کے ذہن کی وسعت اور فکر کے تنوع کا پتہ چلتا ہے۔ کلیات محمد قلی کا دوسرا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جس میں محمد قلی کی ۳۱۲ غزلیں ہیں۔ تیسرے حصے میں دیگر اصناف سخن کے عنوان سے محمد قلی کے ۱۲ قصیدے، ۴۱ رباعیاں، تین مرثیے، چار ریختیاں اور ایک مختصر مثنوی شامل ہے۔ کلیات کے آخر میں ڈاکٹر زور نے دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کی ہے

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کی تدوین زور صاحب کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ تنہا یہی اردو ادب و تحقیق کی دنیا میں ان کے نام کی بقائے دوام کا ضامن ہونے کے لیے کافی ہے۔

طالب و موہنی: مثنوی طالب و موہنی سید محمد والہ موسوی (متوفی ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۰ء) کی تصنیف ہے۔ والہ ایک ایرانی نژاد امیر تھے جو اپنے والد سید محمد باقر موسوی خراسانی کی وفات کے بعد شہر قم سے ترک وطن کر کے شاہ عالم (۱۱۱۶ھ / ۱۲۲۴ء) کے عہد حکومت میں دہلی آئے اور شاہی منصب داروں میں شامل ہو گئے۔ نظام الملک سے مخلصانہ روابط کی بنا پر ان کے ساتھ وہ دکن آئے اور نوابان ارکاٹ کے دربار سے متوسل ہو گئے، انھوں نے ترچناپلی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔

والہ بہت بڑے مصنف، شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی مثنوی "طالب و موہنی" کو دکن میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں انھوں نے اورنگ آباد اور احمد نگر کے جنوب میں موجود عثمان آباد کے قریب واقع ایک تاریخی شہر پرینڈہ کی ایک مقبول عام عشقیہ داستان نظم کی ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۱۳۷ھ سے قبل پرینڈہ ہی میں قلم بند کی تھی (۱۴)۔ طالب و موہنی کا قصہ ایک ہندو مہاجن کی بیٹی موہنی اور ایک مسلمان نوجوان طالب کے عشق کی المناک داستان پر مبنی ہے۔ طالب و موہنی کے تین قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کا مخزونہ ہے، دوسرا انڈیا آفس (لندن) کی زینت ہے اور تیسرا نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور نے اول الذکر مخطوطے کی مدد سے اس مثنوی کا متن مرتب کر کے سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو کے تحت ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ کتاب کے آغاز میں انھوں نے ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں مصنف اور اس کی تصنیف کا تعارف کروایا گیا ہے۔

بعض محققین نے والہ کو قطب شاہی دور کا شاعر قرار دیا تھا زور صاحب نے مقدمے میں اس خیال کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ چوں کہ والہ نے اس مثنوی میں قطب شاہی دور کے شاعر ابن نشاطی اور اس کی مثنوی "پھول بن" کا تذکرہ کیا ہے غالباً

اسی لیے بعض محققین نے والہ کو قطب شاہی دور کا شاعر سمجھا ہوگا۔ والہ نے یہ مثنوی دراصل ابن نشاطی کی "پھول بن" کے جواب میں لکھی تھی۔ زور صاحب کا خیال ہے کہ طالب و موہنی، پھول بن کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی۔ ڈاکٹر زور نے اس میں لسانی اہمیت کے دو پہلو بتائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی تصنیف اس زمانے میں ہوئی جب کہ دکنی زبان زوال سے دوچار تھی اور شمالی ہند کے محاورے سے دکن کے شاعر و ادیب بتدریج متاثر ہو رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ والہ ایک ایرانی نووارد تھے۔ انھوں نے یہ مثنوی ٹھیٹ دکنی زبان میں نہیں لکھی بلکہ شمالی ہند کے محاورے، دکنی بولی اور فارسی زبان کو ملا کر ایک نیا اسلوب پیدا کیا جو انھیں سے مخصوص تھا۔ ان کی زبان نہ خالص اردو ہے نہ ٹھیٹ دکنی بلکہ دونوں کی ملی جلی خصوصیات کا آمیزہ نظر آتی ہے۔

طالب و موہنی کی اس اعتبار سے بھی اہمیت ہے کہ میر کی مثنوی "دریائے عشق" کا قصہ والہ کی اسی مثنوی سے ماخوذ ہے (۱۵)۔ اگرچہ کہ میر نے کہیں بھی اپنے ماخذ کا تذکرہ نہیں کیا تاہم دریائے عشق کے اکثر حصے خصوصاً اختتامیہ والہ کی طالب و موہنی کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور کا مرتبہ متن اگرچہ کہ ایک ہی مخطوطے پر مبنی ہے لیکن ایک قدیم ادب پارے کے تحفظ کے نقطہ نظر سے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کتاب محققین کے لیے ایک حوالہ کی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر زور کے مذکورہ بالا تحقیقی و تدوینی کارناموں کے علاوہ قدیم ادب سے متعلق ان کے بعض ادھورے اور نامکمل کام بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں جو کسی وجہ سے منظر عام پر نہیں آسکے۔ یہاں ڈاکٹر زور کی اسی نوعیت کی تدوینی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ارشاد نامہ: ارشاد نامہ بیجاپور کے مشہور صوفی شاعر برہان الدین جانم کی عارفانہ مثنوی ہے جو لسانیاتی نقطہ نظر سے محققین کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں "ارشاد نامہ" کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسی کی مدد سے اس مثنوی کا متن مرتب کیا تھا۔ مثنوی کے آغاز سے قبل انھوں نے

ایک پر از معلومات مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے مصنف کے آباء و اجداد، واقعات حیات اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے ۔ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد سے طبع ہوئی ۔ ڈاکٹر زور کے مرتبہ ارشاد نامے کی طباعت چوں کہ مکمل نہیں ہو سکی تھی اس لیے اس کا سال طباعت نامعلوم ہے ۔ البتہ زور صاحب کی بعض دیگر کتابوں میں ارشاد نامے کا ذکر ملتا ہے جس کی بنیاد پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس کی تدوین کا کام ۱۹۳۷ء کے بعد اور ۱۹۴۰ء سے قبل کیا تھا اور ۱۹۴۳ء کے قریب یہ کتاب زیر طبع تھی (۱۶) ۔

زور صاحب کی مرتبہ یہ کتاب ۲۲۲۰ ابیات پر مشتمل ہے جب کہ انھوں نے اپنی ماقبل تصانیف اردو شہ پارے اور دکنی ادب کی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ مولوی عبدالحق نے بھی اپنے ایک مضمون میں "ارشاد نامہ" کے اشعار کی تعداد ڈھائی ہزار ہی بتائی ہے (۱۷) ۔ اس مثنوی کے فوری بعد جانم کی مشہور نظم "سکھ سہیلا" نقل کی گئی ہے ۔ اس کے بعد منتخبات نظم و نثر شاہ برہان کے زیر عنوان جانم کی بعض نظموں مثلاً محبتہ البقا، بشارت الذکر، منفعت الایمان، نکتہ واحد، رموز الواصلین خیال اور دوہروں کے نمونے دیے گیے ہیں ۔ عنوان کے برعکس اس میں نثر کا کوئی نمونہ شامل نہیں ہے ۔ ارشاد نامہ کو ڈاکٹر زور کے شاگرد مولوی اکبرالدین صدیقی نے ایک سے زائد نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی ترجمان "قدیم اردو" کی ایک جلد کی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ۔

سکھ سہیلا: ڈاکٹر زور کے مرتبہ ارشاد نامے میں جانم کی مشہور صوفیانہ نظم "سکھ سہیلا" بھی مرتب کی ہے ۔ سکھ سہیلا کا شمار دکن کی مخصوص صوفیانہ شعری اصناف میں ہوتا ہے ۔ جانم کے اس سہیلے میں اٹھائیس بند ہیں ۔ ہر بند چار چار مصرعوں پر مشتمل ہے ابتدائی تین مصرعے ہم قافیہ اور چوتھا ٹیپ کا مصرع ہے ۔ "سہیلا" اصل میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جو تعریف میں ہو مہاں (جانم نے) اسے روحانی معنوں میں لیا ہے (۱۸) ۔

زور صاحب نے سکھ سہیلا کے مکمل متن کی تدوین کی ہے لیکن یہ وضاحت

نہیں کی ہے کہ انھوں نے کتنے اور کون کون سے قلمی نسخوں کی مدد سے یہ متن مدون کیا ہے۔ سکھ سہیلا کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور کا مرتبہ متن نسخہ آصفیہ کے متن سے متعدد مقامات پر مختلف ہے (۱۹)۔ برہان الدین جانم کے سکھ سہیلا کو ڈاکٹر حفیظ سید نے انگریزی مقدمے اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے جو الہ آباد یونی ورسٹی اسٹڈیز میں شامل ہے (۲۰)۔

ابراہیم نامہ: ڈاکٹر زور نے دبستان بیجاپور کو شاہ کار اور بے نظیر مثنوی "ابراہیم نامہ" کی بھی تدوین کی تھی۔ ابراہیم نامہ عبدل کی تصنیف ہے۔ عبدل کے حالات پردۂ خفا میں ہیں مثنوی کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ مثنوی ۱۶۰۳ء کی تصنیف ہے۔ تاحال ابراہیم نامہ کے صرف دو مخطوطات دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کی زینت ہے اور دوسرا راجہ اوندھ (مہاراشٹرا) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور نے اول الذکر نسخے سے اس مثنوی کا متن تیار کر کے طبع کروایا تھا لیکن کسی وجہ سے یہ کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا اور اس کتاب کی اشاعت عمل میں نہ آسکی۔ یہ کتاب مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے ۱۹۳۶ء میں مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد میں طبع ہوئی۔ بحالت موجودہ ڈاکٹر زور کا مرتبہ ابراہیم نامہ ۷۰ صفحات پر مبنی ہے اس میں مقدمہ نہیں ہے۔ مشکل اور غیر مانوس الفاظ کے معنی ان کے نیچے خفی قلم سے درج کیے گئے ہیں (۲۱)۔ عبدل کی یہ مثنوی تاریخی اور لسانی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خان نے نسخہ سالار جنگ اور نسخہ اوندھ کے تقابل سے اس مثنوی کو مرتب کیا اور یک عالمانہ مقدمے اور حوالہ و فرہنگ کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں شعبہ لسانیات علی گڈھ مسلم یونی ورسٹی سے شائع کیا۔ جناب دیوی سنگھ چوہان نے بمبئی سے اس مثنوی کو یوناگری رسم الخط میں شائع کروایا۔

تاج الحقائق: ڈاکٹر زور کے نامکمل تحقیقی و تدوینی منصوبوں میں دکنی نثر کی مشہور کتاب "تاج الحقائق" کی تدوین بھی شامل ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ

سالار جنگ حیدرآباد کی زینت ہے۔ ڈاکٹر زور نے تاج الحقائق کا متن اسی نسخے کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا بڑا حصہ طبع بھی ہو چکا تھا۔ لیکن بعد میں یہ کام تعویق میں پڑتا گیا۔ ڈاکٹر زور اس کتاب کو سلسلہ یوسفیہ کے تحت چھپوانا چاہتے تھے۔ موجودہ صورت میں یہ نسخہ ۸۰ صفحات اور تین ابواب پر مشتمل ہے۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ اس کتاب کے سرورق پر "تاج الحقائق" شاہ میراں جی شمس العشاق مرتبہ زور درج ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس نسخے کے بعض مقامات پر کاتب کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے اور ایک صفحہ پر (ص ۵۷ پر) انھوں نے "بعد اصلاح پروف ثانی روانہ کریں" تحریر کر کے دستخط اور تاریخ (۱-۹-۴۹ء) درج کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب جنوری ۱۹۴۹ء میں پروف کے مرحلے میں تھی (۲۲)۔

تاج الحقائق کے مصنف کے بارے میں محققوں کے خیالات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محققین بشمول ڈاکٹر جمیل جالبی اسے وجہی کی تصنیف نہیں مانتے لیکن بعض اسے وجہی کی تصنیف تسلیم کرتے ہیں۔ کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ نسخہ کی پیشانی پر لکھا ہے "میراں جی شمس العشاق" نیز ترقیمے میں "سب رس تصنیف میراں جی شمس العشاق" (۲۳) کے الفاظ درج ہیں۔ تاج الحقائق کے مصنف کے تعلق سے زور صاحب نے قطعی رائے قائم نہیں کی تھی۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے کہیں اسے وجہی کی تصنیف بتایا ہے اور کہیں اس کے مصنف کے بارے میں شک و شبہے کا اظہار کیا ہے۔ کسی ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی میں انھوں نے شک و یقین کی ملی جلی کیفیت کے باعث غالباً اس کتاب کی اشاعت کا کام مکمل نہیں کیا اور تقریباً ۲۰ سال بعد ڈاکٹر نورالسعید اختر نے چار مخطوطوں کی مدد سے تاج الحقائق کے متن کی تدوین کر کے بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر اختر نے اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ ان کی مرتبہ کتاب ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ ڈاکٹر زور نے دکن اور شمال کے قدیم اور عہد متوسط سے تعلق رکھنے والے بعض شعرا کے کلام کے انتخابات بھی اپنے مفید اور جامع مقدموں کے ساتھ شائع کیے۔ ذیل میں ان پر طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔

منتخبات پر مشتمل ایک کتاب معانی سخن کے نام سے مرتب کی تھی جس میں انھوں نے محمد قلی کی نظموں، غزلوں، قصیدوں، رباعیوں اور مراثی کا انتخاب شامل کیا ہے۔ ابتداء میں دیباچہ عمومی ہے اور اس کے بعد ایک مختصر مقدمہ بھی ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ اور اس کی شاعری کے بارے میں اہم باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر سیدہ جعفر "معانی سخن" کلام محمد قلی قطب شاہ کا ایک اچھا انتخاب ہے اور اس کی شاعری کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے یہ نکتہ پیش نظر رکھا ہے کہ ایسی نظموں کا انتخاب کیا جائے جن سے شاعر کے طرز ادا اور اس کے مخصوص تصورات کی بخوبی ترجمانی ہو سکے۔ اور اس مقصد میں ڈاکٹر زور اس لیے بھی کامیاب رہے کہ انھوں نے کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مقدمے میں شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی تھی (۲۴)۔

ڈاکٹر زور کے بعد ڈاکٹر جاوید وششٹ نے ۱۹۶۸ء میں "غزال رعنا" کے نام سے محمد اکبرالدین صدیقی نے ۱۹۷۲ء میں "انتخاب محمد قلی قطب شاہ" کے عنوان سے محمد رفیق اسلم نے ۱۹۷۸ء میں "انتخاب معانی" کے نام سے اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ۱۹۸۹ء میں "انتخاب کلام قلی قطب شاہ" کے عنوان سے محمد قلی کی شاعری کے انتخابات شائع کئے۔

قصص خوب ترنگ: خوب ترنگ گجرات کے مشہور صوفی شاعر خوب محمد چشتی کی صوفیانہ مثنوی ہے۔ جس میں انھوں نے حکایات و تمثیلات کے ذریعے معرفت کے مسائل کی تفہیم کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس مثنوی سے کچھ نصیحت آموز قصوں کا انتخاب مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب Les cotes du Hub Tarang کے زیر عنوان الیشاٹک جرنل (پیرس) بابتہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں ایک طویل مقالے کی شکل میں شائع ہوئی۔ اسی کے آف پرنٹس کو انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس میں انھوں نے خوب ترنگ میں منظوم چند حکایتوں کا متن پیش کیا ہے۔ حواشی میں اختلاف نسخ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ زور صاحب نے فرانسیسی زبان میں تحریر کیا ہے جس میں مصنف اور اس کی تصنیف کا مختصر تعارف قلمی نسخوں کی

اردو شاعری کا انتخاب: ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر زور نے ساہتیہ اکیڈیمی کی فرمائش پر اردو شاعری کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ۳۰۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اردو کے بہترین اور اپنے اپنے دور اور مکتب خیال کے نمائندہ ۱۰۸ شعراء کے منتخب کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کے کلام سے پہلے چند سطور میں اس واقعات حیات اور شاعری کے بارے میں اہم معلومات قلم بند کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے یہ انتخاب پانچ سال کی محنت کے بعد مرتب کیا لیکن اس کے باوجود اس میں ترتیب و تدوین کی بعض خامیاں رہ گئیں جن کی طرف بعض محققین نے توجہ دلائی ہے (۲۶)۔ کتاب کے آغاز میں ایک مختصر سا دیباچہ ہے اور آخر میں اعتذار کے عنوان سے ان شعراء کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کا کلام باوجود استحقاق کے کسی وجہ سے اس انتخاب میں بار نہ پاسکا
سخن سیریز: ڈاکٹر زور نے ماضی قریب سے تعلق رکھنے والے دکن کے مختلف اساتذہ سخن کے کلام کا انتخاب بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ ان کے مرتبہ انتخابات کے نام اس طرح ہیں۔

فیض سخن	:میر شمس الدین فیض کے کلام کا انتخاب
رمز سخن	:سدا انند جوگی بہاری لال رمز کے کلام کا انتخاب
بادۂ سخن	:ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا انتخاب
کیف سخن	:سید رضی الدین حسن کیفی کے کلام کا انتخاب
متاع سخن	:نواب عزیز جنگ کے کلام کا انتخاب

ڈاکٹر زور کی ترتیب و تدوین سے متعلق ان کتابوں کے اس تفصیلی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ دکنی ادب کی تاریخ، تحقیق و تنقید اور لسانیات کے علاوہ تدوین متن کے شعبے میں بھی انھوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ متقدمین اور معاصرین میں بہت کم محقق اس شعبے میں ان کی ہم سری کر سکتے ہیں۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر گیان چند ۔ تحقیق کا فن ۔ ص ۴۲۷۔
(۲) ڈاکٹر گیان چند ۔ تحقیق کا فن ۔ ص ۴۲۷۔
(۳) بہ حوالہ نیا دور ۔ لکھنؤ ۔ اگست ۱۹۹۷ء ۔ ص ۱۷۔
(۴) ڈاکٹر خلیق انجم ۔ متنی تنقید ۔ ص ۱۹۔
(۵) ادبی تحقیق مسئل اور تجزیہ (از رشید حسن خاں) ص ۸۹۔
(۶) ڈاکٹر اکبر علی بیگ ۔ مرزا لطف حیات اور کارنامے ۔ ص ۱۰۷۔
(۷) ڈاکٹر زور کی فارسی خدمات از نور الاسلام صدیقی ۔ مشمولہ محی الدین قادری زور ۔ ص ۱۳۹۔
(۸) مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ۔ ص ۱۱۱۔
(۹) مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ۔ ص ۳۶
(۱۰) مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ۔ ص ۱۴۳۔
(۱۱) ڈاکٹر زور ۔ تذکرہ گلزار ابراہیم ۔ ص ۳۳۔
(۱۲) ڈاکٹر نور الاسلام صدیقی ۔ ڈاکٹر زور کی فارسی خدمات ۔ ص ۱۳۹۔ مشمولہ محی الدین قادری زور
(۱۳) ڈاکٹر زور ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۔ ص ۳۱۲۔
(۱۴) معین الدین جینا بڑے ۔ مثنوی طالب و موہنی مشمولہ بازیافت (تحقیقی مجلہ کشمیر یونیورسٹی) ۱۹۹۷ء ۔ ص ۱۱۲۔
(۱۵) مدارس میں اردو ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ ص ۲۹۔
(۱۶) محمد نسیم الدین فریس ۔ ڈاکٹر زور اور تدوین متن ۔ سب رس حیدر آباد ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء ۔ ص ۴۲۔
(۱۷) مولوی عبد الحق ۔ قدیم اردو ۔ کراچی ۱۹۶۱ء ۔ ص ۳۵۔
(۱۸) ایضاً ص ۲۷۔
(۱۹) بہ حوالہ سب رس ۔ حیدر آباد ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء ۔ ص ۴۳۔
(۲۰) قدیم اردو ۔ حیدر آباد (ارشاد نامہ) ۱۹۷۱ء ۔ ص ۴۰۔
(۲۱) سب رس ۔ حیدر آباد ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء ۔ ص ۴۳۔
(۲۲) بہ حوالہ سب رس ۔ حیدر آباد ۔ جنوری ۱۹۹۰ء ۔ ص ۱۳۔
(۲۳) بہ حوالہ سب رس ۔ حیدر آباد ۔ جنوری ۱۹۹۰ء ۔ ص ۱۳۔
(۲۴) ڈاکٹر سیدہ جعفر ۔ ڈاکٹر زور ۔ ص ۹۴-۹۵۔
(۲۵) بہ حوالہ سب رس ۔ حیدر آباد ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء ۔ ص ۴۳۔
(۲۶) رشید حسن خاں ۔ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ ۔ ص ۲۱۷-۲۵۶۔

"نعت رسول خدا" کے بارے میں مشاہیر ادب کے تاثرات

"حضور اکرمؐ کی مدح و ثناء اور آپؐ کا بیان ایک سعادت ہے۔ جو محمد علی آثر کو حاصل ہوئی ہے۔ آثر نے پہلی بار اتنی طویل نعت کہی ہے۔ ان کی یہ نعت شریف کئی حیثیتوں سے اردو نعت کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ سب سے پہلی بات اس کا عنوان ہی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ "نعت رسول خدا" کے اعداد سے اس کی تاریخ تصنیف ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۰ء) نکلتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حضور اکرمؐ کے اسم مبارک "محمدؐ" کے اعداد کے کوئی سو سے زیادہ اسمائے مبارک اس میں ملتے ہیں۔ چوتھی بات یہ کہ اپنی نوعیت کی یہ طویل ترین نعت ہے۔"

(پروفیسر یوسف سرمست)

"نعت رسول خدا" درود و سلام پر مشتمل نعتیہ نظم ہے۔ جس کی تخلیق و تحریر کی سعادت ڈاکٹر محمد علی آثر کے حصے میں آئی ہے۔ ان کی اس نظم کو پڑھتے ہوئے بے اختیار چشم بینا سے اشک ہائے عقیدت رواں ہو جاتے ہیں اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ڈاکٹر آثر کا سینہ یقیناً عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ایسی کیفیت جو دل و دماغ کو اک گونہ تقدس و ترفع سے ہم کنار کر دے کسی سطحی اور کھوکھلی تخلیق سے عیاں ہو یہ ناممکن و محال ہے۔"

(ڈاکٹر راہی فدائی)

"میں نے اس نعت مسلسل کے تمام اشعار بہ یک وقت پڑھ لیے اور آپ کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا قائل ہو گیا۔ مضمون میں ایسی اثر آفرینی کسی سچے عاشق رسولؐ کا قلم ہی پیدا کر سکتا ہے۔"

(شان بھارتی ایڈیٹر سہ ماہی "رنگ" دھنباد)

قطعۂ تاریخ اشاعت "مقالاتِ اثر"

تصنیف : ڈاکٹر محمد علی اثرؔ

ادب کو مل گئے افکار کے جوہر
ہر اک مضمون میں ہے فکر کی خوشبو
یہ تاریخِ طباعت ہے شکیلؔ اس کی
"مقالاتِ اثر" تحقیق کے جگنو

٢٠٠٠ء

نتیجۂ فکر : جناب فاروق شکیلؔ